ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۹-۱۶ مارچ ۱۹۷۲ء

وڈیرہ بھٹو — ہاری بھٹو

قیمت : — ۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے : — ۵ ، پیسے

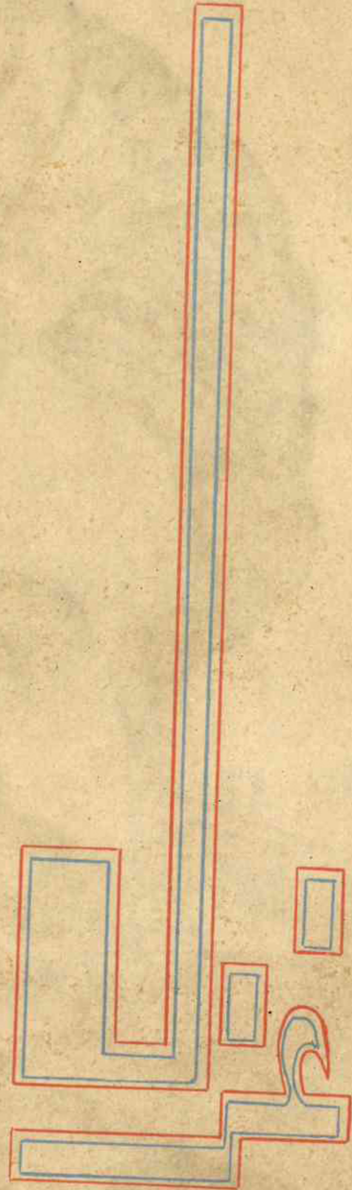




محسن بھوپالی







دریا سمجھ رہے تھے جسے وہ سراب تھا
ظاہر ہُوا کہ تشنہ لبی کا عذاب تھا

جن کو تھا پاسِ عشق وہ خلوت نشیں رہے
اس انجمن میں جو تھا فضیلت مآب تھا

کس کربِ آگہی میں گذاری ہے زندگی
لمحہ بھی میرے واسطے یومِ حساب تھا

اب جگنوؤں سے مانگ رہے ہیں سحر کی بھیک
وہ ہونٹ جن پہ ذکرِ گلِ آفتاب تھا

اِک عُمر ساتھ دے کے بھی ہم اجنبی رہے
پچھلی رفاقتوں کا سفر کیا تھا خواب تھا

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد : ۲ — شمارہ : ۴۳

۹ - ۱۶ مارچ ۱۹۷۲ء

خاص مضامین

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت : - ۶۰ فلس دوبئی قطر : ۷۵ درم
سعودی عرب : ۵ قرش - انگلستان ۴ شلنگ ۶ پنس

مقامِ اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۰ ڈی نصرت کمرشل ایریا
پی ای سی ایچ ایس کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر : - ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد۔ کراچی

ٹیلیفون : — ۴۱۲۲۷۴

وڈیرہ بھٹو — اور ہاری بھٹو

جاگیردار بھٹو — اور عوامی بھٹو

صدر بھٹو نے یکم مارچ ۱۹۷۲ء کو زرعی اصلاحات کا اعلان کر دیا ہے۔ ان کا تعلق ملک کے اس مظلوم طبقے کے مستقبل سے ہے جو دیہات میں رہتا ہے، اکثریت میں ہے اور جس پر ہماری معیشت کا دارو مدار ہے۔ وہ سب سے زیادہ کماتا ہے۔ محنت اور مشقت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ لیکن اس پر ہی تمام مظالم ڈھاتے گئے۔ یہی تمام محرومیوں کا مستحق ٹھہرا، ہر دور میں اِسے ہی نظر انداز کیا گیا۔ ہر ایک نے اسے لُوٹ کھسُوٹ کا نشانہ بنایا۔ غضب تو یہ ہے کہ اِس نے جب کبھی اپنے حق کے لیے آواز بلند کی تو اسے حاکموں نے کوڑوں کا مستحق قرار دیا۔ وڈیرے نے اُس کی عزت و آبرو سے ہوس پُوری کی اور دیس کی دھرتی کی ہریالی کے رکھوالوں کے خون سے ندی نالوں کا رنگ بدلتا رہا۔

صدر بھٹو نے جب آمریت کے خلاف بغاوت کی تو ان کی آواز کھیتوں اور کھلیانوں تک پہنچی۔ انہیں محسُوس ہُوا کہ ایک جاگیردار اُن کے درمیان کھڑا ہے۔ اپنے سامعین کے زخموں پر آنسو بہا رہا ہے۔ اس کی آواز میں خلوص ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے سامعین پر ظلم کے دروازے بند ہو جائیں۔ اس کے لیے وہ اُنہیں متحد ہونے کے لیے کہہ رہا ہے۔ اس آواز پر کھیت اور کھلیان کے لوگ اکٹھے ہُوتے۔ انہوں نے ایوب آمریت کو ٹھکانے لگا دیا۔

اس کے بعد ایک بدترین آمر یحییٰ خان کی شکل میں اقتدار پر قابض ہوگیا۔ اس نے اپنے دورِ اقتدار میں اس مظلوم طبقے پر ہر قسم کے مظالم کے تجربے کیے مگر وہ حیران تھا کہ ننگے اور نیم جاں جسموں پر کوڑوں کے جواب میں جو نعرہ بلند ہو رہا ہے، وہ "جیئے بھٹو" ہے۔ خون کی دھار

کے ساتھ اس نعرے کی وابستگی سے اُن جسموں کو اپنی آئندہ نسلوں کے روشن مستقبل کی امید نظر آ رہی تھی۔

بالآخر نامساعد اور تباہ کن حالات میں پاکستان پیپلز پارٹی کو اقتدار مل گیا۔ ایک طرف ملک کی سالمیت کو مسلسل خطرہ لاحق اور دوسری طرف ان مظلوم شہریوں کی توقعات تھیں۔ ملک دُشمن سقوطِ مشرقی پاکستان کے باوجود آج بھی سقوطِ اسلام آباد کے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔ ان حالات میں صدر بھٹو نے زرعی اصلاحات کا اعلان کیا ہے۔ یہ اصلاحات ہیں اور انقلاب کے فلسفے پر گامزن ہونے والے جیالوں کے لئے خوش فہمی یا غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں رکھتیں۔ موجودہ حالات میں یہ ایک ترقی پسند عمل ہے انقلاب کی جانب آگے بڑھنے کے لئے کھیت اور کھلیانوں کے مالکوں سے اتحاد کا راستہ متعین کرتا ہے۔

یہ درست ہے کہ ان اصلاحات کے اعلان سے کسانوں، ہاریوں اور کھیت مزدوروں کی کایا نہیں پلٹے گی۔ یہ پہلی بار متوازن زرعی اصلاحات کی حیثیت سے سننے میں آئی ہیں۔ ان پر عمل درآمد باقی ہے۔ اوّل تو عمل درآمد کا مرحلہ آئے گا۔ اگرچہ اِن اصلاحات پر مکمل عمل کے باوجود زمینداروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ پندرہ ہزار پیداواری یونٹ یا ۱۵۰ ایکڑ کی حد اراضی کی ملکیت میں سے جو کوئی بھی زیادہ ہو کی شرط کی روشنی میں کوئی بھی زمیندار ۱۵۰ ایکڑ اراضی کا پابند نہ رہ سکے گا کیونکہ سندھ میں ایک ایکڑ تقریباً ۴۴ یونٹ کا ہے۔ اور اس طرح یہاں حد اراضی ۳۴۰ ایکڑ اور پنجاب میں لائلپور جیسی زرخیز زمین کا ایک ایکڑ ۶۵ یونٹ پر مشتمل ہوتا ہے۔ حدِ اراضی ۲۴۰ ایکڑ ہوگی۔ سندھ میں زیادہ تر اراضی بارانی ہے اور کوئی بارانی ایکڑ ۹ یونٹ سے زیادہ پر مشتمل نہیں، اس لئے اس کی حد ملکیت سترہ سو ایکڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے باوجود ڈیڑھ لاکھ اور پچاس ہزار ایکڑ اراضی کے مالکان پر چوٹ پڑے گی، اُنہیں پانچ پانچ دس دس ہزار ایکڑ اراضی سے محروم ہونا پڑے گا۔ اس کے لئے وہ بے دخلیوں اور انتقامی کارروائیوں جیسے پرانے ہتھکنڈے استعمال کریں گے۔ اور مشینی کاشت کے تحت ملنے والی سہولت کی آڑ میں مزید بیروزگاری پھیلائیں گے۔ کشت و خون ہوگا کلہاڑیاں حرکت میں آئیں گی اور یقیناً بندوقوں کے دھانے دھاڑیں گے۔ اس کی روک تمام حکومت وقت کی ذمہ داری ہے

ان اصلاحات پر عمل درآمد سے بڑی جاگیروں کے ٹوٹنے سے مثبت انقلابی نتائج برآمد ہوں گے۔ پیپلز پارٹی کے اندر جاگیرداروں کا طبقاتی کردار کھل کر سامنے آئے گا۔ وہ جو پارٹی کے قائد جناب بھٹو کا دم بھرتے ہیں، انہیں ثابت کرنا ہوگا کہ وہ کہاں تک وفادار ہیں۔ وہ کس حد تک قربانی دے سکتے ہیں۔ یا پھر اس عمل کے دوران ہی دوڑ لگا جاتے ہیں۔ انہیں احساس ہو جاتے گا کہ کنونشن لیگ کا منشور صرف ایک کاغذی دستاویز تھا۔ اور اسے مؤرخوں نے صرف حوالے کے لئے محفوظ کر لیا ہے کہ عوام سے یوں بھی فراڈ کیا گیا تھا۔ لیکن پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور جس دَور میں سامنے آیا ہے' اس دَور کے عوام میں ایک عظیم اُبھار ہے۔ وہ سیاسی شعور رکھتے ہیں اور اچھے بُرے کی تمیز کرنا جانتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے منشور پر عمل ہو۔

صدر بھٹو کا طبقاتی کردار ایک جاگیردار کا ہے۔ سیاسی کارکنوں کا کام ہے کہ وہ بھٹو وڈیرے کو بھٹو ہاری بنا دیں۔ اس عمل میں پیپلز پارٹی کے جاگیردار مزاحمت کریں گے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے یہ جاگیردار بھٹو کے دوست نہیں۔ بھٹو کے دوست مظلوم عوام اور مزدور کسان ہیں۔ عوامی بھٹو تاریخ میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا اور جاگیردار بھٹو کو تاریخ فراموش کر دے گی۔

عوامی بھٹو تاریخ میں ہمیشہ کیلئے زندہ رہیگا اور جاگیردار بھٹو کو تاریخ فراموش کردے گی

جنرل گل حسن اور رحیم خان کی خُفیہ حکومت کے

اشاروں پر چلنے والے اب بھی محفوظ ہیں

"واقفِ حال" کے قلم سے

یہ ہفتہ پاکستان کی موجودہ تاریخ کا انتہائی اہم ہفتہ تھا۔

یکم مارچ کو زرعی اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ ریڈیو، ٹیلی وژن سے خصوصی جشن منایا گیا۔ اگرچہ اس جشن کی تُک اس وقت بنتی تھی، جب مزارع اور ہاری ان اصلاحات سے حاصل ہونے والی زمینوں کے مالک بن چکے ہوتے۔ ان زرعی اصلاحات کا اعلان بنفسہٖ بہت بڑا قدم ہے۔ کیونکہ پیپلز پارٹی میں بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی موجودگی کے باعث لوگوں کو خطرہ تھا کہ زرعی اصلاحات کی شاید باری نہ آئے۔ میں دوسرے لوگوں کی طرح ان اصلاحات کو بالکل بیکار یا ناکافی نہیں کہوں گا۔ کیونکہ پیپلز پارٹی نے اپنے منشور میں جن اصلاحات کا اقرار کیا تھا۔ حالیہ اصلاحات اِن منشوری اصلاحات کے کافی نزدیک ہیں، اس لئے بلاوجہ تنقید کا کوئی سبب نظر نہیں آتا اور بلکہ یہ دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے کہ ان اصلاحات پر مکمل طور پر عمل درآمد ہو سکے کیونکہ اس سے قدم آگے ہی بڑھیں گے۔ مکمل انقلاب کی توقع رکھنے والے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ انتخابی عمل سے کبھی انقلاب آتا ہے اور نہ پیپلز پارٹی جیسی مختلف الطبقات پارٹی پرولتاری انقلاب لا سکتی ہے۔ وہ جو کچھ کر سکتی ہے۔ اسی کو مکمل طور پر کرنے کے لئے اس پر دباؤ ڈالنا چاہیئے۔ اور غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنے کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔ پیپلز پارٹی بہرحال ایک زینے کا کام دے رہی ہے۔ انقلاب کے لئے راستہ ہموار ہو رہا ہے۔ رجعت پرست طاقتیں، سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو برقرار رکھنے کے لئے پیپلز پارٹی کی اصلاحات کی مخالفت کر رہی ہیں۔ جماعت اسلامی جیسی کٹر رجعت پرست طاقت بھی اب زرعی اصلاحات کی اس لئے مخالفت کرتی ہے کہ اس سے زمینداروں کے مفادات پر پوری طرح زد نہیں پڑتی۔ پیپلز پارٹی ڈانواں ڈول متوسط طبقے کی طرح ہے۔ اگر بائیں بازو کی قوتوں نے اسے منزل تک پہنچنے کے لئے ایک راستہ سمجھنے کی بجائے اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں تو ایسا نہ ہو کہ یہ رجعت پرستوں سے اپنا ناطہ مکمل طور پر جوڑ کر بائیں بازو سے بالکل کٹنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہوگا اس سے یقیناً بائیں بازو کو نقصان پہنچے گا۔ بائیں بازو کو ایک مثبت اور واضح پروگرام لے کر سامنے آنا چاہیئے۔

اس ہفتے دوسرا اہم واقعہ دو فاصلی تے وڈے فوجی وڈیروں کی سبکدوشی ہے۔ لیفٹننٹ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان، بھٹو صاحب کے بہت قریبی اور معتمد خیال کئے جاتے تھے۔ غیر ملکی اخبارات کے نزدیک تو بھٹو صاحب کو ایوانِ صدر میں لے جانے والے یہی لوگ تھے۔ ہم نے اس وقت بھی لکھا تھا کہ فوج کو اس وقت خود سامنے آنے کی ہمت نہیں تھی، اس لئے وہ مجبور ہو گئی تھی کہ عوام کے منتخب نمائندے کو سامنے لائے ورنہ گل حسن جیسے اقتدار پرست کب کرسئ صدارت کو چھوڑ سکتے تھے۔ دونوں حضرات سائے کی طرح صدر بھٹو کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ بھٹو صاحب بھی اسی لئے کہتے تھے کہ

معظم علی، میر خلیل الرحمٰن، پیر علی محمد راشدی، نے صدر سے معافی مانگ کر سودے بازی کرلی

مارشل لاء ضرور اٹھے گا، اور ایسے اٹھایا جائے گا کہ پھر کسی فوجی مہم جو کو کبھی ہمت نہ ہو کہ وہ ملک کے مفاد کے نام پہ مارشل لاء نافذ کر سکے۔ پشاور میں پولیس ہڑتال، سرحد اور بلوچستان میں نظم ونسق کی بگڑتی ہوئی حالت، نیشنل عوامی پارٹی کا عوامی لیگ والا لب ولہجہ اختیار کرنا بے سبب نہ تھا اور خاص طور پر سرمایہ دارانہ اخبارات۔ جنگ اور ڈان۔ کا آزادئ صحافت کا علمبردار ہونا بلاوجہ نہیں تھا۔ ان اخبارات کو آج تک ہمت نہیں ہوتی تھی۔ "الفتح" میں لکھا گیا تھا کہ فوج میں سے کچھ سیاسی مفادات رکھنے والے عناصر، بیوروکریسی اور رجعت پرست طاقتوں کے آپس میں رابطے ہیں اور وہ بھٹو حکومت کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ الطاف گوہر ایک کردار تھا۔ معظم علی میر خلیل الرحمان، غنی اعرابی، شیخ آفتاب احمد کی بار بار ملاقاتیں کیوں ہوتی ہیں۔ پی پی آئی۔ سن، ڈان، جنگ۔ بھٹو حکومت کے خلاف محاذ کیوں بنا لیتے ہیں۔ یہ کون سا گٹھ جوڑ تھا۔ حکومت سے ٹکر لینے کی ہمت کیسے ہوئی۔ سرحد میں پولیس کی ہڑتال ایک منظم انداز میں کیسے پھیل گئی۔ پیپلز پارٹی کے مخلص کارکنوں، نوجوان طالب علموں کے اتحاد کو کمزور کر دیا گیا۔ یہ بھی گٹھ جوڑ تھا۔ اور جس روز صدر بھٹو نے "لمبے" اور "ٹھگنے" آدمی کے ٹولے کی سرگرمیاں جان لیں اور انہیں بے اختیار کرنے کیلئے کارروائی شروع کر دی۔ جس میں کامیاب بھی ہو گئے۔ اِس کا اعلان اگرچہ کافی دنوں بعد ہوا۔ مگر ان لوگوں پر گرفت پہلے ہی حاصل کی جا چکی تھی۔ اِس روز کے بعد اِس ٹولے کے سویلین افراد نے معافیاں مانگنی اور پاؤں پڑنا شروع کر دیا۔

یہ ایک نہایت شرمناک بات ہے کہ ایوانِ صدر میں موجود ایک بیوروکریٹ ان تمام عوام دشمن افراد کی صدر بھٹو سے ملاقات کا اہتمام کروا رہے ہیں۔ جنہوں نے۔

- ۲۴ سال تک عوام کیخلاف تمام سازشوں میں حصّہ لیا
- ایوبی آمریت کے ہاتھ مضبوط کئے اور اس کے خلاف چلنے والی عوامی تحریک کی پُر زور مخالفت کی۔
- پیپلز پارٹی کے قیام سے لے کر صدر بھٹو کے برسرِ اقتدار آنے تک پیپلز پارٹی کی مخالفت کی۔ بھٹو پر کتنا کیچڑ اچھالا۔

ایوانِ صدر کے ایک بیوروکریٹ کی پُراسرار سرگرمیاں

• حکومت کے قیام کے بعد بھی بھٹو کی مخالفت کی کیونکہ وہ اب بھی اِسی عوام دشمن ٹولے کے اشاروں پر چل رہے تھے۔ جواب تک برسرِاقتدار رہا ہے۔

مگر جب انہوں نے اِس ٹولے کو بے اختیار ہوتے دیکھا تو فوراً راولپنڈی پہنچے، اور ایک پرنسپل سیکرٹری۔ جو وزارت اطلاعات کے سیکرٹری بھی ہیں۔ انہیں نہ جانے اس ٹولے سے کیا واسطہ ہے۔ بہرحال انہوں نے بھٹو سے پی پی آئی کے معظم علی کی ملاقات کا انتظام کیا۔ یہ وہی معظم علی ہیں جنہیں بھٹو صاحب نے "فکس اپ" کرنے کے لئے کہا تھا اور جنہیں سی آئی اے کا ایجنٹ کہا۔ پیپلز پارٹی نے خاص طور پر ایک جلوس پی پی آئی کی مذمت کے لئے نکالا تھا۔ ممتاز اے علوی صاحب کے ہاتھ میں نہ جانے کیا ہے کہ ایک ملاقات میں معظم علی صاحب سی آئی اے کے ایجنٹ رہے اور نہ انہیں فکس اپ کرنے کی ضرورت رہی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی سروس بند کر کے معظم علی صاحب کو "فکس اپ" کرنے کی جو ابتداء کی گئی تھی، وہ بھی ختم ہوگئی اور معظم صاحب نے پنڈی سے واپس آکر بھٹو حکومت کے خلاف خبریں گریڈ کرنے کا سلسلہ ختم کرنے کی ہدایت کردی۔ اس سودے بازی کا انجام کیا ہوگا۔

اِنہی پرنسپل سیکرٹری نے میر خلیل الرحمان کی ملاقات صدر بھٹو سے کروائی۔ اِس کے بعد کوئٹہ سے "جنگ" نکلنے کا اعلان ہوگیا۔ اور جنگ میں سے بھٹو حکومت کی مخالفت بھی ختم ہوگئی۔ ڈان کے مظہر علی خان مِل آئے تو "ڈان" اور "حریت" کا لہجہ بھی نرم ہوگیا۔

پیر علی محمد راشدی نے نہ جانے کون سا کارنامہ ادا کیا ہے کہ وہ بھی وزارتِ اطلاعات کے مشیر بن گئے ہیں۔ پیر علی محمد راشدی نے اپنے کالموں کے ذریعے پاکستان میں جو زہر گھولا اور سیاسی پلیٹ فارم پر الیکشن میں پیپلز پارٹی کے منشور کی مخالفت کی۔ چند معافیوں سے اِس کی تلافی ہوگئی۔

اخبارات کی مشاورتی کونسل میں پھر وہی چہرے آگئے جو ایوب خان کے زمانے سے اب تک چلے آرہے ہیں۔ ایک بے چارے زیڈ اے سلہری رہ گئے ہیں۔ سنا ہے ممتاز اے علوی ان کی ملاقات کا بھی انتظام کروا چکے ہیں۔

یہ پورا وہی ٹولہ ہے جس نے ایوب خان کے زمانے میں اطلاعاتی ذرائع پر قبضہ کر کے عوامی تحریکوں کی مخالفت کی اور عوام کو کچلا۔ یحییٰ خان کو مشرقی پاکستان تک کا سودا کرنے میں آسانی اس لئے رہی کہ جنگ، ڈان، پی پی آئی سب اس کے ساتھ تھے اور عوام کو آخر تک بے خبر رکھا جا سکتا اور جب اندر سے لائن آئی کہ یحییٰ خان بے اختیار ہوگیا ہے تو ان لوگوں نے مرحوم متحدہ مخلوط پارٹی کی قرارداد بڑے زور شور سے شائع کی کہ یحییٰ خان مستعفی ہو جائے۔ اِس روز انہوں نے متحدہ مخلوط پارٹی کو اس لئے اہمیت دی تھی کہ بھٹو صاحب کو ابھرنے

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

زرعی اصلاحات ایک نظر میں

ملک کے پہلے عام انتخابات میں پاکستان کے کسانوں، کاشتکاروں اور ہاریوں نے "زمین اُس کی جو ہل چلائے" کے نعرے پر ووٹ دیے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے منشور میں زمین کی حد ملکیت ۱۵۰ ایکڑ مقرر کی تھی۔ جبکہ دوسری جماعتوں نے ۲۰۰ ایکڑ۔ چنانچہ عوام نے پاکستان پیپلز پارٹی کو منتخب کیا تاکہ وہ اپنے منشور پر عمل درآمد کرے۔ یکم مارچ کو یعنی صدر بھٹو نے برسرِاقتدار آنے کے ۷۱ دن بعد زرعی اصلاحات کا اعلان کردیا۔ جس کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

• زمین کی انفرادی ملکیت کی حد کم کردی گئی ہے۔ نہری اراضی کی حد پانچ سو ایکڑ سے کم کر کے ۱۵۰ ایکڑ مقرر کی گئی ہے جب کہ بارانی اراضی کی حد ملکیت ایک ہزار ایکڑ سے کم کر کے ۳۰۰ ایکڑ یا ڈیڑھ ہزار پیداواری یونٹ کے مساوی مقرر کی گئی ہے۔

• ملکیت اراضی کا تعین افراد کی بنیاد پر ہوگا، خاندان کی بنیاد پر نہیں۔

• حکومت بلوچستان پٹ فیڈر کے علاقے میں تمام اراضی معاوضہ ادا کئے بغیر حاصل کرے گی اور اسے علاقے کے بے زمین اور غریب کسانوں کو دے گی۔

• سرکاری ملازمین کی سو ایکڑ سے زائد اراضی بحق سرکار ضبط کرلی گئی ہیں۔

• فوجی افسروں نے سرحدی علاقے کی دفاعی پٹی سے تبادلے کے ذریعہ محفوظ اندرونی علاقوں میں جو اراضی حاصل کی ہے۔ ان کی تمام دستاویزات منسوخ کردی گئی ہیں۔

• سرکاری اراضی اب کلی طور پر ان کسانوں کے لئے مخصوص ہوگی۔ جن کے پاس یا تو زمین نہیں ہے یا اگر ہے تو گزارے سے کم ہے۔ مسلح افواج کے لئے بھی کافی علاقہ محفوظ رکھا جائے گا۔

• سرکاری زرعی اراضی کے نیلام پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ سرکاری اراضی کی قیمت آسان قسطوں میں وصول کی جائے گی۔ ان زمینوں کو سالانہ پٹے پر دینے کا طریق کار ختم کردیا گیا ہے۔

• یک طرفہ اور جبری بے دخلی فوری طور پر بند کردی گئی ہے۔ مستقبل میں مزارع کی بیدخلی اُسی وقت ممکن ہوگی جب وہ زراعت کے تقاضے پورے کرنے میں ناکام ہو جائے گا۔

• آبیانہ اور تمام زرعی ٹیکس، مالکان ادا کریں گے، بیجوں کی فراہمی اور ان کی قیمت کی ادائیگی مالکان کی ذمہ داری ہوگی۔ جب کہ باقی سرمایہ کاری میں مالکان اور مزارع برابر کے شریک ہوں گے۔

• زمین کی فروخت کی صورت میں مزارع کو حق شفع حاصل ہوگا۔

• موجودہ اصلاحات کے تحت مزارع کو زمین کی ایک پائی بھی ادا نہیں کرنی ہوگی۔ ۱۹۵۹ء کی اصلاحات کے تحت باقی اقساط بھی وصول نہیں کی جائیں گی۔

• زمین کے غلط گوشوارے جمع کرنے کی بناء پر گوشوارے جمع کرنے والے اور اس کے زیر کفالت افراد کی تمام جائیداد خواہ وہ زرعی ہو یا دوسری ہو ضبط کی جا سکے گی۔

• حکومت ایک خاندان کے درمیان انتقال اراضی کی اس وقت تک عام اجازت دے گی جب تک یہ اراضی مقررہ حدود میں ہو اور ۱۵ ہزار پیداواری یونٹ کی مقررہ حد سے متصادم نہ ہو۔

بین الاقوامی تعلقات

روس چین کو تنہا کر کے اس کی مکمل اقتصادی ناکہ بندی کرنا چاہتا تھا۔

امریکہ نے تمام ہتھیار آزمانے کے بعد چین کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے



امریکہ اور چین کے درمیان مفاہمت، پاکستان کی سیاسی کامیابی

قمر رضا جعفری

امریکہ اور چین کے مشترکہ اعلامیہ نے دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ سرخ چین کی ابھرتی ہوئی قوت کو نہ تو کوئی طاقت نظر انداز کر سکتی ہے اور نہ ہی بین الاقوامی برادری اس کے جائز مقام سے محروم کر سکتی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ امریکہ کی چین کے ساتھ بائیس سالہ دھاندلیوں کی تاریخ میں چین کے رہنماؤں نے کبھی بھی نہ تو امریکہ کے کسی سیاست داں کو چین کا دورہ کرنے کی دعوت دی اور نہ ہی خود بھی امریکہ کا دورہ کرنے کی پیش کش کی۔ امریکی حکومت نے ہر ایک ہتھیار آزما لینے کے بعد بالآخر عظیم چین کے آگے خود ہی گھٹنے ٹیک دیے۔ یقینی طور پر صدر امریکہ کا دورۂ چین، چین کی عظیم ترین اخلاقی فتح ہے اور چین کی اس عظیم فتح کو ہم مغربی استعمار کے خلاف ایشیائی عوام کی مکمل فتح سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

امریکہ اور چین کے درمیان مفاہمت کی اہمیت کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ چین کے دورے پر روانہ ہونے سے قبل صدر نکسن نے دنیا کے لوگوں سے اس دورے کی کامیابی کے لئے مختلف گرجوں میں دعائیں مانگنے کی اپیل کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ صدر نکسن کا چین سے واپسی سے قبل یہ بیان کہ اس ایک ہفتے نے دنیا بدل کر رکھ دی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ یہ بیان اگر ایک طرف امریکی حکومت کے چین کی طرف سے بے جا شکوک دور کرنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے تو دوسری طرف امریکہ کی خارجہ حکمت عملی میں ایک حقیقت پسندانہ رجحان کی غمازی کرتا ہے۔ امریکہ کی خارجہ حکمت عملی کا یہ حقیقت پسندانہ رجحان اس امر کی تائید کرتا ہے کہ دنیا کے عوام کو عموماً اور ایشیائی عوام کو خصوصاً کسی بیرونی دخل اندازی کے بغیر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا حق حاصل ہے۔

امریکہ کی خارجہ حکمت عملی کے اس جدید رجحان کا واضح ثبوت چین اور امریکہ کا وہ مشترکہ اعلامیہ ہے جس میں فارموسا کو چین کا اٹوٹ حصہ تسلیم کر کے وہاں سے امریکی فوجوں کی واپسی کا یقین دلایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جموں اور کشمیر کے لوگوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایشیائی ممالک سے امریکی فوجوں کا انخلاء اور ایشیائی عوام کو اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا حق اسی بات کا بین ثبوت ہے کہ امریکہ ایشیا میں چین کے سیاسی نظریات کو نہ صرف تسلیم ہی کرتا ہے بلکہ امریکہ ایشیائی ممالک کی قیادت کے چینی حق کو تسلیم کرتے ہوئے ایشیا میں کوئی قدم بھی چین کی مرضی کے خلاف اٹھانا نہیں چاہتا۔

مشترکہ اعلامیہ میں پاک بھارت فوجوں کی اپنی پرانی سرحدوں میں واپسی اور جموں اور کشمیر کے عوام کو اپنے مستقبل کے فیصلے کے لئے آزادانہ رائے شماری کا حق اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ امریکہ اور چین بھارت کو ایک جارح ملک سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مشترکہ اعلامیہ میں پاکستان کا خاص طور سے تذکرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ چین اور امریکہ نے بلاواسطہ طور پر پاکستان کی ان کوششوں کو سراہا ہے جو کہ پاکستان بیس سال سے ان دونوں ممالک کو قریب لانے کے سلسلے میں انجام دے رہا ہے۔ چنانچہ چین کو اقوام متحدہ کا ممبر بنانے کے سلسلے میں سخت ترین مخالفتوں کے باوجود پاکستان کی کوششیں کسی سے مخفی نہیں۔ اقوام متحدہ میں چین کے داخلے کی کوششوں کے علاوہ پاکستان کی سفارتی سطح پر دونوں ملکوں کو قریب لانے کی کوششیں بھی دنیا پر واضح ہیں چنانچہ ہنری کیسنجر کا پاکستان کے راستے چین کا خفیہ دورہ بھی پاکستان کی سفارتی سطح پر کوششوں کی ایک کڑی ہے۔ پاکستان کے ذریعے ہنری کیسنجر کا یہ دورۂ چین ہی تھا جس نے روس اور بھارت کو پاکستان کے خلاف اس قدر برافروختہ کر دیا کہ اس کے نتیجے میں روس اور بھارت کا خفیہ فوجی معاہدہ بروئے کار لایا گیا اور جس کے تحت پاکستان کو انتقاماً جارحیت کا نشانہ بنایا

امریکہ چین مفاہمت سے دولتِ مشترکہ کا خاتمہ یقینی ہے



گیا۔ نتائج خواہ کچھ بھی ہوں لیکن امریکہ اور چین جیسے متضاد نظریات رکھنے والے ممالک کے درمیان مفاہمت پاکستان کی ایک بڑی اخلاقی فتح ہے۔

امریکہ اور چین کے درمیان مفاہمت کا سب سے شدید ردِ عمل روس اور بھارت پر ہوا ہے کیونکہ یہ دونوں ممالک یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ امریکہ اور چین کے درمیان شدید اختلافات کے سبب کسی قسم کی بھی مفاہمت کا اِمکان ہے۔ اِن دونوں ممالک کا خیال تھا کہ روس اور بھارت کے معاہدے کے سبب امریکہ اور دوسری مغربی طاقتیں ایشیا میں روس اور بھارت کی بالادستی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گی اور اس طرح ایک طرف روس، چین کو تنہا کر کے اس کی مکمل طور پر فوجی اور اقتصادی ناکہ بندی کر سکے گا اور دوسری طرف بھارت، پاکستان کے خلاف فوجی کارروائی کر کے دوبارہ بھارت کو متحد کر سکے گا۔ چنانچہ امریکہ اور چین کے مشترکہ اعلامیہ پر روس کا چین پر سامراجیوں سے گٹھ جوڑ کرنے کا الزام ان حالات میں قابلِ غور ہے جب کہ خود روس پُرامن بقائے باہمی کے نظریے کے تحت مغربی ممالک کو چین کے خلاف متحد کرنے کی کوششوں میں ایک عرصہ سے مصروف ہے۔ چنانچہ روس کا اشتراکی ممالک سے آپس میں تعاون کا مشورہ اس وقت اور بھی مضحکہ خیز بن جاتا ہے جبکہ خود روس نے تھرڈ انٹرنیشنل کو توڑ کر اشتراکی ممالک کے آپس میں تعاون کے نظریہ پر ضربِ کاری لگائی تھی۔

امریکہ اور چین کے درمیان مفاہمت کا بھارت پر بھی ردِ عمل قابلِ غور ہے کیونکہ بھارت روس سے فوجی اشتراک کے بعد چین کی فوجی ناکہ بندی میں مصروف تھا تاکہ ایشیائی ممالک کی قیادت کو چین سے چھینا جا سکے۔ نہ صرف یہ بلکہ بھارت مشرق بعید کی سیاست میں بھی دخیل ہو کر وہاں سے چین کے اثرات زائل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ بھارت کو یقین تھا کہ بحرِ ہند میں روسی تجارتی بحری اجارہ داری، اس کے اثرات کو جنوب مشرقی ایشیا تک بڑھا دے گی۔ نہ صرف یہ بلکہ روسی اور برطانوی تعاون بھارت کو مشرق وسطیٰ کی سیاست میں بھی دخیل کر دے گا اور اس طرح مشرق بعید جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں بھارتی اثرات اور بحرِ ہند میں اجارہ داری روس و برطانیہ کی تائید کے سبب خود بخود ایک طرف چین کی ایشیائی ممالک کی قیادت سے دستبرداری کی ضامن بن جائے گی اور دوسری طرف امریکہ کو مجبور کر دے گی کہ وہ ایشیائی معاملات میں بھارت کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے بھارت کے ایشیائی ممالک کے خلاف جارحانہ اقدامات کی عموماً اور پاکستان کے خلاف خصوصاً تائید کرے۔

افریقہ کے ممالک کو بھارت نے برطانیہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تاکہ اس کے بدلے میں برطانیہ جنوبی مشرقی ایشیا میں عموماً اور دولت مشترکہ میں خصوصاً بھارتی حکمت عملی کی تائید کرے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں برطانیہ کا رویّہ اور بنگلہ دیش کو ہر قیمت پر دولت مشترکہ کا ممبر بنانے کی برطانوی سازشیں صرف مشرقی پاکستان کے جوٹ اور چائے کی اجارہ داری حاصل کرنے کے لیے ہیں بلکہ افریقہ میں برطانوی حکومت کی مکروہ سازشوں کی بھارتی روسی تائید حاصل کرنے کی کوشش بھی ہے۔

امریکہ اور چین کی مفاہمت افریقہ میں دولت مشترکہ کے زوال کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ افریقہ کے وہ ممالک جو کہ برطانیہ کی رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ میں سامراجی حکمت عملی سے برگشتہ ہیں صرف اس لیے دولت مشترکہ میں رہنے کے لیے مجبور ہیں کہ برطانیہ کے علاوہ کوئی دوسرا ملک نہ تو ان کے خام مال کا خریدار ہے اور نہ ہی ان کی مصنوعات کا کھپت۔ امریکہ جو کہ اب تک افریقہ کے معاملات میں برطانیہ کے مشوروں پر عمل پیرا رہا ہے۔ برطانیہ کے خوف سے افریقی ممالک کی کسی قسم کی بھی سرپرستی سے گریز کرتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ افریقی ممالک صنعتی طور پر پسماندہ ہونے کے سبب دولت مشترکہ میں رہنے کے لیے مجبور ہیں۔ چنانچہ اگر افریقی ممالک کو اپنے خام مال کی فروخت اور نسبتاً سستی مصنوعات کی ترسیل کا یقین ہو

امریکہ روس کے بڑھتے

ہوئے اثر کے تحت

چین کے سامنے اُجھکا

جائے تو ان کی دولت مشترکہ سے علیحدگی ایک فطری عمل ہوگا۔ اور اس لیے افریقی ممالک میں پاکستان اور چین کی سفارتی سرگرمیاں بڑی حد تک ایک دوسرے کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

مشرق وسطیٰ جو کہ اس وقت مختلف نظریات کی کشمکش کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔ گو فی الحال اسرائیلی جارحیت کے خلاف روسی امداد پر تکیہ کرنے پر مجبور ہے لیکن روسی خارجہ حکمت عملی کے تلوّن سے برگشتہ نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ چین مشرق وسطیٰ میں ایک مسلم بلاک کی تشکیل کے لیے پاکستان کی ہمت افزائی کرے تاکہ مشرق وسطیٰ سے روس کے اثرات کو زائل کروایا جا سکے۔

روس اور بھارت کی بحرِ ہند میں اجارہ داری کا مؤثر حل صرف یہی نظر آتا ہے کہ انڈونیشیا کی زیرِ قیادت امریکہ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک مثلاً ملایا، فلپائنز اور آسٹریلیا کا ایک وفاق تیار کروانے میں مدد دے۔

مندرجہ بالا واقعات ثابت کرتے ہیں کہ پاکستان اور چین کی دوستی کتنے صبر آزما مراحل سے گزری ہے اور اسی سبب سے پاکستان کو چین سے دوستی اتنی عزیز ہے لیکن چین اور امریکہ کے درمیان اختلافات کے سبب پاکستان ایک عجیب الجھن کا شکار تھا۔ کیونکہ ایک فریق سے دوستی دوسرے فریق کی دشمنی کا باعث بنتی تھی اور اس لیے پاکستان کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر قیمت پر ان دونوں متضاد نظریات رکھنے والی طاقتوں کے درمیان مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کی کوششیں جاری رکھے۔ امریکہ اور چین کے درمیان یہ تعلقات پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا حکم رکھتے ہیں کیونکہ روس اور بھارت کے فوجی معاہدے نے ایشیا میں عموماً اور بحرِ ہند میں خصوصاً طاقت کے توازن کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے اور اگر ایک طرف پاکستان کی بندرگاہوں کو روسی بحریہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے تو دوسری طرف پاکستانی سرحدوں پر بھارت کی فوجوں کے اجتماع نے پاکستان کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان حالات میں امریکہ اور چین کے درمیان مفاہمت کو پاکستان کی ایک سیاسی کامیابی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔





ٹائپ رائٹر کھڑک رہے ہیں
ٹیلیگرام جا رہے ہیں
اخبار والے مصروف ہیں

پیکنگ میں پہلی رات، پیکنگ ہوٹل کا کمرہ، شاہی بستر

محمود شام

فلم ختم ہو گئی ہے۔

بیگم بھٹو۔ اپنے چینی میزبانوں کے سامنے فلم کی تعریف کرتے ہوئے اٹھ رہی ہیں۔ ہم بڑی بڑی لفٹوں، برآمدوں، راہداریوں اور قالینوں سے ہوتے گریٹ ہال کی پہنائیوں سے باہر نکل رہے ہیں۔ باہر چین اور پاکستان کے پرچم والی سیاہ گاڑی کھڑی تھی۔ جس سے ظاہر تھا کہ ابھی مذاکرات جاری ہیں۔ پیکنگ ہوٹل جانے والا میں اکیلا ہوں۔ باقی سب جا چکے ہیں۔ پیکنگ ہوٹل بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ مجھے گاڑی ایک گیٹ پر اتار گئی ہے گیٹ ایک سا ہے۔ لفٹ ایک سی ہے، چہرے ایک سے۔ میں بڑے اعتماد سے تیسری منزل پر جا پہنچا ہوں۔ مگر مجھے ۳۵۴ نظر نہیں آ رہا ہے۔ ادھر کئی کامریڈ پھر رہے ہیں۔ زبان یارِ من چینی و من چینی نمی دانم۔ ہاتھوں سے اشارہ کرکے بتاتا ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر ایک کامریڈ نزدیک آتے ہیں۔ ان کو میں پہلے تین انگلیاں۔ پھر پانچ انگلیاں، پھر چار انگلیاں کھڑی کرکے سمجھاتا ہوں۔ ان کی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ پھر میں ہوٹل کے ایک حصّے سے نکل کر دوسرے میں داخل ہوتا ہوں پھر تیسرے میں۔ یہاں ہوٹل کا وہ حصہ آ جاتا ہے، جہاں میں ٹھہرا ہوں۔ یہ ۳۵۴ ہے۔ پیکنگ میں رات کے بارہ بجے ہیں۔ اس وقت کراچی میں رات کے ۹ بجے ہوں گے۔ ہم صبح ۶ بجے پنڈی سے چلے تھے۔ گھڑیاں کتنی طویل ہو گئی ہیں۔ یہ دن کتنا لمبا ہو گیا ہے۔ میں نے تاریخ کی کتنی پہنائیاں طے کر لی ہیں۔ وقت کے چکر میں ہم دوپہر کا کھانا بھی نہ کھا سکے تھے۔

اب ۱۲ بج رہے ہیں۔ رات کا کھانا بھی نہ کھا سکے۔ اب خبر نہیں کھانا مل سکے کہ نہیں۔ میں نے پاکستانی سفارت خانے کے ایک نمائندے محمد حسین جو یہاں ہوٹل کے ایک کمرے میں اپنا دفتر قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان سے بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کھانا مل جائے گا۔ انہوں نے ایک چینی میزبان کو سمجھا دیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لگ گیا ہے۔ چینی دسترخوان میں وسعت کے قائل ہیں۔ اتنا کھانا۔ اُف۔ ہنٹر بیف۔ انڈے۔ مچھلی۔ چاول۔ میٹھا۔ بڑی مشکل سے میں نے کھانا کھایا ہے۔ اب اصحاب نقوی کے کمرے کی طرف جا رہا ہوں۔ ٹائپ رائٹر کھڑک رہے ہیں۔ اے پی پی کے افتخار چوہدری سب سے زیادہ مصروف ہیں۔ اخبار والے مطمئن ہیں کہ اے پی پی اور پی پی آئی موجود ہیں اس لئے زیادہ تفصیل بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ پی پی آئی کے ابصار رضوی بھی مصروف ہیں۔ ٹیلی گرام جا رہے ہیں۔ ٹیلی گراف آفس بھی نیچے ہی ہے۔ ایس کے پاشا ٹیلی گرام بھی بھیج رہے ہیں۔ کراچی کے لئے کال بک کر رکھی ہے۔ خورشید حسن میر بھی اس کمرے میں مصروف ہیں۔ رونق لگی ہوئی ہے۔ پیکنگ میں پہلی رات ہے۔ اب نہ جانے کب آئیں۔ یہ رات۔ پیکنگ ہوٹل کا کمرہ۔ شاہی بستر۔

صبح ہم ساڑھے سات بجے جاگ اٹھتے ہیں۔ تیار ہوتے ہیں۔ آج ہمیں پیلس میوزیم میں جانا ہے۔ بھٹو صاحب ادھر بات چیت کریں گے۔ ہم میوزیم وغیرہ دیکھ کر وقت گزاریں گے۔ مجھے احفاظ الرحمان کا فون نمبر مل گیا ہے۔ ٹیلیفون کیا۔ خاتون آپریٹر کی نہایت ہی باریک آواز ہے" سنائی دی ہے۔ میں نے اسے ایکس ٹینشن نمبر بتایا ہے۔ تھوڑی دیر بعد احفاظ الرحمان کی آواز آتی ہے۔ وہ حیران ہو جاتا ہے کہ میں پیکنگ میں ہوں۔ بہت خوش ہوتا ہے۔ پروگرام پوچھتا ہے۔ اس کا ہوسٹل پیکنگ ہوٹل سے خاصی دور ہے۔ اس لئے اس کو آنے میں کم از کم آدھ گھنٹہ لگ جائے گا۔ بہرحال ہم انتظار میں بیٹھ گئے اور نیچے ناشتہ کے لئے ڈائننگ ہال میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد احفاظ الرحمان وہیں آ پہنچا۔ ناشتے کے بعد اٹھے تو لوگ پیلس میوزیم جانے کے لئے تیار تھے۔ مسٹر لو اور مسٹر چن ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ احفاظ الرحمان کے ساتھ حامد ہاشمی بھی تھے، جو چین باتصویر میں کام کرتے ہیں۔ پیلس میوزیم۔ یہ شہرِ ممنوعہ بھی کہلاتا ہے۔ مگر اب یہ شہر ممنوعہ نہیں ہے۔ غیر ملکی افراد بھی یہاں جا سکتے ہیں۔ چین والے بھی اندر رہتے ہیں۔ گاڑیاں اس شہر کے دروازے سے ہوتی ہوئی برف میں ڈھکے ہوئے شاہی قلعے میں داخل ہو رہی ہیں۔ یہاں کبھی بادشاہ رہتے تھے۔ اب بادشاہوں کی صرف یادگاریں ہیں۔ بادشاہتیں ختم ہو گئیں۔ عوام کا راج آ گیا۔ اب عوام ہر چیز کے مالک ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف کھڑے گارڈ۔ چین کی عوامی سپاہ آزادی کے جیالے ہیں۔ قلعے کی وسعتوں پر برف پڑی ہوئی ہے۔ برف اس وقت بھی گر رہی ہے۔ ابھی بیگم بھٹو تشریف نہیں لائی ہیں۔ ہم برف اور سردی سے بچنے کے لئے پناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ پوری طرح گرم کپڑوں میں چھپے ہونے کے باوجود سردی اپنا حملہ کر رہی ہے شاہی قلعہ کے دروازے پر کھڑے ہم انتظار میں ہیں کہ بیگم صاحب آئیں تو پیلس میوزیم دیکھنا شروع کریں۔ (باقی آئندہ)

الفتح

فرسودہ روائتیں نئی نسل کو تباہ کر رہی ہیں

منیر جہلمی

ہمارے معاشرے کی بعض فرسودہ روائتیں نئی نسل کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہیں۔ انہیں ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر یہ اب بھی موجود ہیں۔ دھیرے دھیرے نئی نسل کو نفسیاتی مریض بنا رہی ہیں۔ پورے معاشرے کی جڑیں کھوکھلی، بنجر اور ویران کئے دے رہی ہیں۔ ان فضول اور مردہ قدروں کو سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لئے زندہ رکھا گیا ہے۔ جوان زہر آلود قدروں کے سحر کو توڑ کر ہوش اور جوش کی باتیں کرتے ہیں۔ انہیں سماج کا باغی قرار دے کر معتوب کیا جاتا ہے۔

ہم اظہارِ خیال کی آزادی کے بلند و بانگ دعویٰ کرتے ہیں۔ ایجی ٹیشن کرتے ہیں۔ مظاہرے کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی قید و بند کی صعوبتیں بھی بھگت لیتے ہیں۔ لیکن ہم خود جس ماحول میں پرورش پاتے ہیں اس کا بنیادی اصول اظہارِ خیال پر پابندی ہے۔ لہٰذا اظہارِ خیال کی آزادی کے بعد بھی ہم اس حق سے اُس وقت تک پوری طرح فیض یاب نہیں ہو سکتے جب تک معاشرے سے ایسی تمام پابندیوں اور رکاوٹوں کی بیخ کنی نہیں کر دیتے ـــــ اگر ہم مشرقی ماحول پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ہمیں ان رکاوٹوں اور پابندیوں کا احساس ہو جائے گا۔ جو نئی نسل کو نفسیاتی طور پر مریض بنا رہی ہیں۔ مشرقی سماج میں ایک بچے کی تعلیم و تربیت کا سارا انحصار والدین کی اپنی مرضی اور اپنے خیالات پر ہے۔ وہ عام طور پر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں مطلق العنان آمر کا سا طرزِ اختیار کرتے ہیں۔ اس میں بالغ ہونے والے بچے کی اپنی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ نہ ہی اسے اس بات کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے احساسات و خیالات کے کچلے جانے پر احتجاج کر سکے۔ اس طرح بچہ یا لڑکا تعلیم و تربیت کے معاملے میں کلی طور پر اپنے والدین کا محکوم اور غلام ہوتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے واقعات اور حالات کا تجزیہ اپنے طور پر نہیں کرتا۔ بلکہ والدین کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور انہی کے ذہن سے سوچتا ہے۔ اس کی اپنی سوچ اور اپنے خیالات والدین کی سوچ کے بھاری پتھر کے نیچے دب کر مردہ ہو جاتے ہیں۔

اب بھی بیشتر گھرانوں میں ایسی روائتیں موجود ہیں کہ بڑوں کی گفتگو میں حصہ لینا یا اُن کی باتوں کا جواب دینا ناقابلِ معافی جرم تصور کیا جاتا ہے۔ گویا ہمارے مشرقی گھرانوں کا ماحول اب بھی اس دور کی یاد دلاتا ہے، جب سر اونچا کر کے جواب دینے والوں کا سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ فرق صرف سزا کی کیفیت کا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایسے بے شمار بچے ملیں گے جو خوف سے سہمے سہمے رہتے ہیں اور کسی بات کا جواب دیتے وقت ہکلانے لگتے ہیں۔ اظہارِ خیال کی آزادی کی ابتداء یہاں سے ہونی چاہیئے۔ اگر اسے بنیاد بنا کر ہم نے جدوجہد شروع کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہماری نئی نسل اس مرض سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارہ حاصل نہ کر لے۔

ترقی پذیر معاشرے میں والدین اپنے بچوں کی خواہشات اور ان کی مرضی کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے بچے خوش، بالغ نظر، نڈر اور بے باک ہوتے ہیں۔ ملک و قوم کی تعمیر میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ ہر معاملہ میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور انداز میں اظہار کرتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں دوسرا نفسیاتی مرض چھوٹے بڑے کے امتیاز و افتخار سے پیدا ہوا ہے۔ یہ مرض ہمارے طبقاتی معاشرے کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ خدا نے کسی کو چھوٹا یا بڑا پیدا نہیں کیا۔ لیکن ہمارے معاشرے میں چھوٹا چھوٹا اور بڑا بڑا ہے۔ ہمارا معاشرہ چھوٹے بڑے کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ چھوٹے آدمی کا فرض ہے کہ وہ بڑے آدمی کو سلام کرے چاہے عمر اور بزرگی میں خواہ کتنا بڑا ہو۔ ہمارے مجلسی اور دفتری آداب میں بڑے اور بااثر آدمی کو بیٹھنے اور چھوٹے آدمی کو کھڑا رہنے کا حکم ہے۔ کسی بڑے آدمی کی بات کا یس سر، جی سرکار، حکم سرکار سے جواب نہ دینے والا کمّا، گستاخ، مجلسی آداب سے بے بہرہ تصور کیا جاتا ہے۔ جس معاشرے میں انسان کے درمیان اتنا سنگین تضاد موجود ہو، اس معاشرے کے افراد کا ذہنی مرض میں مبتلا ہو جانا کوئی انہونی بات نہیں۔ ذہنی آزادی کا فقدان معاشرے کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

برِ صغیر کی تقسیم کے بعد امکان تھا کہ پاکستان کا معاشرہ ترقی پسند بنیادوں پر استوار کیا جائے گا۔ صدیوں سے مظلوم اور مجبور انسانوں کے انبوہ کو ذہنی اور جسمانی آزادی میسر آئے گی۔ آزادی اور خوش حالی کا نیا دور شروع ہو گا۔ امتیاز کی ساری دیواریں ڈھ جائیں گی۔ کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا نہ ہو گا۔ بالخصوص نئی نسل فرسودہ روایتوں سے آزاد ہو کر آزادی کی فضا میں پروان چڑھے گی۔ مگر یہ ساری امیدیں سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ نظام کے بوجھ میں دب گئیں۔ اب حالات کسی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں۔ موجودہ قیادت نے حالات میں انقلابی تبدیلی کا وعدہ کیا ہے۔ ہمیں بھی انقلابی بنیاد پر تعمیرِ نو کے پروگرام میں بھرپور حصہ لینا ہو گا۔ ان قدروں کی بیخ کنی کرنی ہو گی۔ جن سے ہمارا معاشرہ ترقی کرنے کی بجائے جمود کا شکار ہے۔ ایک مضبوط صحت مند اور خوش حال پاکستان کا خواب تبھی پورا ہو گا۔



گذشتہ دنوں ٹیلی گراف اینڈ ٹیلی فون ڈائریکٹریٹ ایسوسی ایشن کے انتخابات ہوئے منتخب شدہ صدر مرتضیٰ نواز خاں اور حبیب دیگر ممبروں کے ساتھ کھڑے ہیں۔

پاک بحریہ کے ۱۳۱ جوانوں کی کامیاب مہم



مشرقی پاکستان سے دشمنوں کو زک پہنچا کر پہنچنے والی راجشاہی گن بوٹ

سی ہاک طیارہ

ہماری کشتیوں پر بم اور راکٹ برسا رہا تھا

الفتح رپورٹ

یہ مشرقی پاکستان سے برما فرار ہونے والے پاک بحریہ کے ۱۳۱ جوانوں کے فرار کی سنسنی خیز داستان ہے جیسے اس مہم کے سب لیفٹیننٹ مشتاق احمد نے مجھے سنائی۔ جو آج پیش کی جا رہی ہے۔ بحریہ کے یہ ۱۳۱ جوان ۷ دسمبر سے ۲۰ دسمبر تک جگہ جگہ مکتی باہنی، بھارتی طیاروں، مقامی باشندوں سے لڑتے ہوئے برما پہنچ کر موت کو شکست دی ہے۔

۵ دسمبر کی صبح بڑی منحوس تھی۔ جلیسور پر بھارتی حملے کا زور تھا۔ ہمارے جوان بڑی بہادری سے مورچوں پر ڈٹے بھارتی حملے کا منہ توڑ جواب دے رہے تھے۔ میں کھلنا ڈسٹرکٹ میں گن بوٹ الیکٹریکل آفیسر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہا تھا۔ چونکہ مشرقی پاکستان میں ہنگاموں اور شرپسندوں کی تخریبی کارروائیوں کے سبب سڑکوں اور مواصلات کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا اس لئے پاک بحریہ پر زبردست فرائض عائد ہو گئی تھیں۔ کیونکہ دریائی راستے نقل و حرکت کا مؤثر ذریعہ تھے۔ میں کھلنا ڈسٹرکٹ میں دریائے پسیر پر واقع منگلا اور تیتومیر نیول بیس پر خدمات انجام دے رہا تھا۔

پاک بحریہ کی جنگی کشتیاں بحری راستوں کے ذریعہ بری فوج کی مدد کر رہی تھیں۔ ۶ دسمبر کو جلیسور پر زبردست حملہ جاری رہا۔ رات بھر گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ ۷ دسمبر کی صبح پاک بحریہ کی ہائی کمان سے حکم ملا کہ خالص پور ٹاؤن میں واقع تیتومیر پورٹ اور کھلنا سے ۳۰ میل دور واقع منگلا پورٹ کے جوان جنگی کشتیوں اور فوجی سامان کے ساتھ ڈیڑھ سو میل دور باریسال پورٹ پہنچیں۔ علی الصبح تیتومیر پورٹ اور منگلا پورٹ میں تعینات جنگی کشتیوں کا قافلہ باریسال کے لئے روانہ ہوا۔ اس قافلے میں چار سو کے قریب بحریہ کے افیسر و جوان شامل تھے۔ جن میں کچھ بری فوج کے جوان بھی موجود تھے۔ ہمارے اس بحری قافلے کے سربراہ کمانڈر اقبال تھے۔ میں اس قافلے میں ایم۔ وی باقر نامی ٹگ بوٹ میں سوار تھا۔ میرے ساتھ تین بری فوج کے بہادر جوان تھے۔ ہم ۷ اور ۸ کی درمیانی شب سندربن کے جزیروں میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم باریسال جانے والی نہر میں داخل ہو گئے۔ حدِ نظر تک دریا کے کنارے گھنے جنگل کا لامتناہی سلسلہ جاری رہا۔

۸ دسمبر کی دوپہر سندربن نامی گن بوٹ دریا میں ایک ریت کے ٹیلے میں پھنس گئی۔ اس گن بوٹ پر ۲۷ جوان سوار تھے قافلے کو چونکہ جلدی باریسال پہنچنا تھا اس لئے کمانڈر اقبال نے مجھے حکم دیا کہ میں باقر ٹگ بوٹ کی مدد سے گن بوٹ نکالوں۔ بحری قافلہ باریسال کی جانب کوچ کر گیا۔ ہم ۱۳ افراد سندربن گن بوٹ کو نکالنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد سندربن گن بوٹ ریت کے ٹیلے سے نکالی گئی۔ شام ہو رہی تھی کچھ دور ہم نے سفر کرنے کے بعد طرہاٹ نامی جگہ پر لنگر ڈال دیا۔ یہاں رات کی تاریکی میں یکایک ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ چونکہ ہم دریا کے درمیانی حصے میں لنگر انداز تھے۔ اس لئے گولیاں ہم پر اثر نہیں کر سکیں۔ ۹ دسمبر کا سورج طلوع ہو چکا تھا ہم نو بجے ہرن گھاٹا نامی دریا میں داخل ہوئے۔ سہ پہر کے قریب کادھلے نامی جگہ سے ہم نے اپنا رخ "گاؤخان" نامی نہر کی جانب موڑا یہ راستہ باریسال جاتا تھا۔

۸ اور ۹ کی درمیانی رات سندربن کے انجن میں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اور باقر ٹگ بوٹ سے سندربن گن بوٹ کو باندھنا پڑا۔ گاؤخان نہر میں مکتی باہنی کا زور تھا۔

دریا کے دونوں جانب سے وقفے وقفے سے مکتی باہنی کے دستے ہم پر اندھا دھند فائرنگ کرتے رہے۔ ہمیں سہ پہر کے قریب باریسال پورٹ نظر آئی جہاں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ باریسال پورٹ کے سامنے دوسرے کنارے پر کھیتوں میں بھی کسی آدمی کا نام و نشان تک نہ تھا ہمیں یہ منظر دیکھ کر بڑی تشویش ہوئی۔ کیونکہ ہم سے ایک دن قبل چار سو افراد کا قافلہ باریسال کے لئے روانہ ہوا تھا۔ جہاں انہیں ہمارا انتظار کرنا تھا۔ ہمیں فوری خطرے کا احساس ہوا کیونکر گہما گہمی کے اس شہر میں موت کا سا سناٹا ہمیں بے حد عجیب لگا۔ ابھی ہم باریسال پورٹ کے قریب بھی نہ پہنچے تھے کہ یکایک لاکھوں مسلح مکتی باہنی کے جوان دریا کے دونوں کناروں سے نمودار ہوئے اور ہم پر بندوقوں اور مشین گنوں سے شدید حملہ کر دیا۔ ہم نے فوراً کشتیوں کا رخ واپس موڑا۔ حملہ چونکہ شدید تھا اس لئے ہم نے واپس جانا بہتر سمجھا۔ ۱۰ دسمبر کی شام کو ہم خلیج بنگال پہنچ گئے جہاں سندربن جنگل کے ایک چھوٹے جزیرے میں رات بسر کی۔ ۱۱ کی صبح ہم نے چاٹگام کے مشرق کی جانب سفر شروع کیا۔ صبح گیارہ بجے جب ہم سندر



پاک بحریہ کے چیف آف سٹاف وائس ایڈمرل ایچ ایچ احمد ایک جوان سے بات چیت کر رہے ہیں

بن کے گھنے جنگل سے اٹے ہوئے دریائی راستے سے گذر رہے تھے کہ ہمیں وکرنت طیارہ بردار جہاز سے اڑکر آنے والے بھارتی سی ہاک طیارے نے دیکھ لیا۔ ہم نے فوراً مشین گنیں اور طیارہ شکن توپیں سنبھال لیں۔ جونہی سی ہاک طیارہ نیچی پرواز کرتا ہوا ہماری جانب آیا ہم نے زبردست حملہ کیا۔ جس پر پائیلٹ نے گھبراہٹ کے عالم میں دو بم گرائے جو ہم سے کافی فاصلے پر گرے۔ لیکن بم کے شدید دھماکوں سے دریا میں بھونچال آگیا۔ ابھی ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ طیارہ دوبارہ نمودار ہوا اور راکٹ مارا جو سندر بن گن بوٹ کو لگا۔ سندر بن گن بوٹ پر ۲۷ افراد سوار تھے۔ لیکن معجزانہ طور پر تمام افراد اور گن بوٹ بچ گئی۔ گن بوٹ کا انجن اس حملے میں ناکارہ ہو چکا تھا۔ تین چار گھنٹے بعد سی ہاک طیارے نے دوسری مرتبہ حملہ کیا۔ لیکن ہماری زبردست جوابی فائرنگ کے سبب وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

۱۲ر کی رات ہم چار چلی نامی جزیرے میں پہنچ گئے۔ رات بھر بھارتی طیارے ہمیں تلاش کرتے رہے لیکن اندھیرے اور گھنے جنگل کے سبب وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکے۔ سندر بن گن بوٹ کی نقل و حرکت ہمارے لئے ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ کیونکہ اس گن بوٹ کی بڑی جسامت کے سبب طیارے باآسانی اُسے دیکھ لیتے تھے اور اس گن بوٹ کا انجن خراب ہونے کے سبب مسلسل کھینچنا پڑتا تھا۔ رات ہم ساتھیوں نے مشورے کے بعد سندر بن گن بوٹ کو ڈبو دیا۔ اور باقر نگ بوٹ میں سندر بن کا تمام راشن اور سامان چڑھا کر پتوں اور گھاس پھونس سے ڈھک دیا۔ ۱۲، ۱۳، اور ۱۴ر دسمبر تک لاتعداد سی ہاک طیارے سندر بن گن بوٹ کی تلاش میں نیچی پروازیں کرتے رہے۔ ہم جنگل میں چھپے بیٹھے رہے۔ ۱۵ سے ۱۷ر دسمبر تک ہم چار چلی میں مقیم رہے۔ یہ جزیرہ جس میں تمام بنگالی تھے۔

——— یہ افراد چونکہ ایک پاکستان کے حامی تھے۔ اس لئے انہوں نے ہماری بڑی مدد کی۔ ہمارے پاس کمزور ریڈیو سیٹ تھا۔ جس سے ہمیں صرف چاٹگام ریڈیو سنائی دیتا تھا۔ جس سے ۱۴ر دسمبر تک نشر ہونے والی خبروں سے پتہ چلتا تھا کہ پاکستان بڑی بہادری سے جنگ کر رہا ہے۔ یہاں پر کچھ شرپسند تھے لیکن وہ ہم سے ڈرے رہے۔ ۱۵ر دسمبر کو ہم نے آل انڈیا ریڈیو سے سقوط کی خبر سنی بعد میں راولپنڈی اسٹیشن سے سابق صدر یحیٰی خاں کی تقریر سننے کے بعد ہمارے سامنے بھیانک اندھیرا چھا گیا۔ ہم نے فوراً صلاح و مشورے کے بعد چاٹگام جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور برما فرار ہونے کا منصوبہ تیار کیا۔ ہم یہاں سے روانہ ہوئے۔ رات میں خلیج بنگال کے آخری پاکستانی جزیرے میں پہنچ گئے۔ یہ جزیرہ ساڑھے تین میل لمبا ہے۔ جس میں سب کے سب سادہ لوح مسلمان بستے تھے۔ انہوں نے دنیا سے بے خبر ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے اُن سے راشن خریدا۔ صبح جب ہم یہاں سے برما روانہ ہو رہے تھے کہ کچھ بنگالیوں نے ہم

راستے میں ہماری کشتی ریت کے ٹیلے میں پھنس گئی

سے زیر تعمیر پہلی مسجد کے لئے چندہ مانگا۔ ہم اشکبار آنکھوں سے اپنی جیبوں سے ۹۵ روپے کا چندہ دے کر خلیج بنگال میں داخل ہو گئے۔ برما فرار کے مشن کے سربراہ سب لیفٹیننٹ اقبال احمد خان اور میں مقرر ہوئے۔ ۱۸، ۱۷، اور ۱۹ کی صبح تک ہم ۱۶۰ میل دور سمندری راستہ طے کر چکے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمیں کوئی بھارتی جہاز راستے میں نہیں ملا۔ کیونکہ ہم نے اپنا راستہ جنوب کی سمت رکھا، پھر ایک دن ایک رات کے سفر کے بعد مشرق کی سمت مڑے، تاکہ ہم سیدھے برما کے سمندر میں داخل ہوں۔ ۱۹ر دسمبر کی صبح ساڑھے پانچ بجے ہم برما کے سمندر میں داخل ہو چکے تھے۔ بائیں جانب ہمیں مشرقی پاکستان اور برما کو جدا کرنے والا دریا ٹیک ناف نظر آرہا تھا۔ ۱۹ر دسمبر کی سہ پہر ہم نقشوں اور چارٹ کی مدد سے برما کی بندرگاہ اکیاب پہنچ گئے۔

اکیاب لائٹ ہاؤس کے قریب ہمیں ایک پاکستانی ٹگ بوٹ ایم۔ وی سلیم اللہ نظر آئی۔ جو چند گھنٹے قبل چاٹگام سے یہاں ۱۲۷ افراد کو لے کر پہنچی تھی۔ پاکستانی سفارت خانے کے عملے نے ہمیں کیمپ میں رکھا۔ ۲۰ر دسمبر سے ۱۹ر جنوری تک ہم وہاں رہے اور اس ماہ بذریعہ طیارہ کراچی پہنچ گئے۔ ہماری اس مہم میں ۲۶ بحریہ کے جوان، دو افسر اور ۱۳ آرمی کے جوان شامل تھے۔

کوئٹہ قلات کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی — پردہ چاک

روپیہ بے گھر افراد کا — عیاشی ڈائریکٹروں کی

الفتح رپورٹ

کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائیٹیاں لوٹ کھسوٹ کا ایک موثر ذریعہ بن گئی ہیں۔ اس شہر میں اس قسم کی سینکڑوں سوسائیٹیاں ہیں جو عوام کو دھوکہ دیکر لاکھوں روپے اِدھر اُدھر کر دیتی ہیں۔ سوسائٹی کے عہدیدار عوام کی رقم کو اپنی عیاشی اور تفریحات پر خرچ کر دیتے ہیں۔ سوسائٹی کے سیکرٹری سوسائٹی کے فنڈ پر طیارہ کی فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ ایمبسڈر اور انٹرکانٹی نینٹل میں قیام کرتے ہیں۔ سوسائٹی کے سرمایہ سے ٹیپ ریکارڈ، ریڈیو، ٹیوٹا کار اور ہزاروں روپے کا فرنیچر خریدا جاتا ہے اور سالہا سال گزرنے کے بعد بھی مستحق ممبروں کو زمین الاٹ نہیں کی جاتی۔ بلکہ انہیں اتنا پریشان کیا جاتا ہے کہ ان کا سارا حوصلہ ختم ہو جاتا ہے اور پھر وہ خاموشی سے اپنی پونجی پر فاتحہ پڑھ کر گھر بیٹھ جاتے ہیں۔

کوئٹہ قلات کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی بھی اپنے ممبروں کے لئے پلاٹوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتی ہے — ۲۹ نومبر ۱۹۶۶ء میں اسے رجسٹر کروایا گیا اور ۳۰ جون ۷۰ء میں اسسٹنٹ رجسٹرار کواپریٹو سوسائیٹیز کراچی سے سوسائٹی کے حسابات کی چھان بین کرائی گئی یعنی ٹھیک پانچ سال بعد اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس دوران سوسائٹی کے فنڈ کو کس طرح استعمال کیا گیا اس کی چند جھلکیاں آڈٹ رپورٹ کی روشنی میں پیش خدمت ہیں۔

ٹیلیفون کال رجسٹر

ٹیلیفون کال کے لئے ایسا کوئی رجسٹر نہیں رکھا گیا جس سے پتہ چل سکے کہ کتنے پرائیویٹ اور کتنے دفتری ضرورت کے تحت کال کئے گئے۔ اس مد میں اچھی خاصی رقم صرف کی گئی۔

کیش بک کی چیکنگ

کیش بکوں کی چیکنگ کے دوران پتہ چلا کہ سوسائٹی کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھاری رقوم اپنے پاس رکھی گئیں۔ جب کہ سوسائٹی کے قواعد نمبر ۳۷ میں واضح ہدایت موجود ہے کہ سیکرٹری کے پاس نقد رقم کی صورت میں ۵۰ روپے سے زائد رقم نہیں رہنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ چیکوں کو نقد رقم کی صورت میں دکھایا گیا۔ یہ بات اصولاً غلط ہے۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں ۲ ہزار ۲ سو پچیس روپے کی رقم بذریعہ چیک موصول ہوئی۔ لیکن کیش بک میں صرف ایک ہزار ۵ سو ۲۵ روپے کی رقم درج کی گئی۔ سات سو روپے کی کمی کو ۱۹ نومبر ۱۹۶۸ء میں پورا کیا گیا۔ سوسائٹی کے فنڈ سے بعض ادائیگیوں میں بے ضابطگیوں کا انکشاف کیا گیا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۶۷ء کو ۳ سو ۶۰ روپے کا فرنیچر خریدا گیا تھا۔ لیکن ریکارڈ میں کیش میمو نہیں دکھایا گیا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۶۷ء کو اخبارات میں ایک سو ۱۳ روپے ۲۰ پیسے کے اشتہارات دیے گئے لیکن اس کا بل پیش نہیں کیا گیا۔ ۲۹ مارچ ۱۹۶۷ء کو ایک سو ۹۵ روپے میں بجلی کا پنکھا خریدا گیا مگر اس کا بھی کیش میمو پیش نہیں کیا گیا۔

اِس طرح کی بے شمار بے قاعدگیاں کی گئیں۔

۶۸-۱۹۶۷ء

یکم فروری ۱۹۶۸ء کو ایک وزیر کے استقبالیہ پر ۲ ہزار ۸ سو ۲۹ روپے خرچ کئے گئے۔ اس میں کئی اشیاء کی خریداری بھی شامل ہے۔ مگر ریکارڈ میں ایک کیش میمو پیش نہیں کیا گیا۔

۶۹-۱۹۶۸ء

۱۳ فروری ۱۹۶۸ء کو زمانہ پرنٹنگ پریس کو ایک ہزار ۴ سو ۵۹ روپے کی ادائیگی کی گئی۔ واضح رہے کہ یہ پرنٹنگ پریس سوسائٹی کے چیئرمین کی ملکیت ہے۔ یہ کواپریٹو سوسائیٹیز رولز ۱۹۲۷ء کے تحت سخت قابل اعتراض بات ہے کہ کسی سوسائٹی کا عہدیدار سوسائٹی کے ذرائع کو اپنے نجی کاروبار کے لئے استعمال کرے۔ یکم اکتوبر ۱۹۶۸ء کو ۶ سو ۵۰ روپے کا ایک ریکارڈ پلیئر خریدا گیا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو دوبارہ زمانہ پرنٹنگ پریس کو طباعت کے لئے ایک ہزار ۵ سو ۵۶ روپے ادا کئے گئے۔ ۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو ۹ سو روپے میں کار ریڈیو خریدا گیا۔ ۲۴ جون ۱۹۶۹ء کو مسٹر محمد یوسف ولد نواب خان کو دستی چیک کے ذریعہ ۴ ہزار ۵ سو ۹۵ روپے کی رقم واپس کی گئی اس کا کوئی واؤچر موجود نہیں ہے۔ مسٹر محمد یوسف کی رکنیت ۲۹۷ ہے۔

۷۰-۱۹۶۹ء

۱۱ جولائی، ۱۵ جولائی اور ۳۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو مختیار کار کراچی کو بندوبستی چارجز میں بالترتیب ۴۰ ہزار ۴ سو ۵۲ روپے، ۱۲ ہزار ۷ سو ۱۳ روپے ۲۵ پیسے، ۹۰ ہزار دو سو ۱۳ روپے ۲۵ پیسے کی رقم ادا کی گئی۔ ان کی رسیدیں ریکارڈ پر موجود نہیں ہیں۔ ۲۱ مارچ ۱۹۷۰ء کو ادارۂ ترقیات کراچی کو ٹاؤن پلاننگ کی فیس کی صورت میں ۱۶ ہزار ۸ سو ۸۰ روپے دیے گئے۔ ہزار کی رسید کا کہیں پتہ نہیں۔ سوسائٹی کے صدر مسٹر فصیح اقبال کو ۹ ہزار کی رقم واپس کی گئی۔ لیکن موصوف نے رسیدیں جمع نہ کیں۔ ۲ مئی ۱۹۷۰ء کو ایک ہزار ایک سو ۷۰ روپے دفتر کا

سوسائٹی نے ایک وزیر کے استقبالیے پر تقریباً تین ہزار روپے خرچ کئے

کرایہ دیا گیا۔ اس کی رسید جمع نہ کی گئی۔ اُسی تاریخ کو دفتر کے کرایہ کے لئے ۳۰۴۰ روپے کی رقم ادا کی گئی۔ مگر اس کی کوئی رسید نہیں لی گئی۔

اسی طرح زمین کی قیمت کی ادائیگیاں چیک کی بجائے نقد اور دستی چیکوں کے ذریعہ کی گئیں۔ آڈٹ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ یہ ادائیگیاں کراس چیکوں کے ذریعہ ہونی چاہئیں۔ اس کے علاوہ تنخواہوں اور الاؤنس کی ادائیگی میں بعض بے ضابطگیوں پر آڈٹ کے اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۹۶۹ء میں سوسائٹی نے اپنے اسٹاف کی تنخواہ اور الاؤنس پر ۲۱ ہزار ۹ سو ۴۴ روپے ۵۰ پیسے خرچ کئے گئے۔ جبکہ ترقیاتی کاموں کا ٹھیکہ الاعظم لمیٹڈ کو دے دیا گیا ہے۔ سوسائٹی کو اتنے بڑے اسٹاف رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ٹیلی گرام، ٹیلیفون اور ٹکٹوں پر ۵ ہزار ۸ سو ۴۳ روپے خرچ کئے گئے۔ ۳ ہزار ۳ سو ۹۹ روپے صرف ٹیلی فون کالوں پر صرف کئے گئے۔ سوسائٹی ۲۰ افراد کے اسٹاف پر ہر ماہ تقریباً ۴ ہزار روپے خرچ کر رہی ہے۔

سوسائٹی نے ساڑھے تیس ہزار روپے مالیت کا ایک ٹریکٹر اور ٹریلر بھی خریدا۔ جب کہ ڈیولپمنٹ کے لئے ۱۰ روپے اور ۷ روپے مربع گز کی شرح سے الاعظم لمیٹڈ کو ٹھیکہ دیا گیا اور اس مد میں انہیں تقریباً ۳ لاکھ روپے ادا کئے گئے۔

سوسائٹی نے ۳۰ جون ۱۹۷۰ء تک اپنے ۲۶۵ ممبروں سے حصص کی شکل میں ۲،۶۵،۰۰۰ روپے اور زمین کی قیمت کی صورت میں ۳۰،۴۳،۷۶۹ روپے وصول کئے۔ جن میں ۳۶،۷۶،۴۱۴ روپے ادا کر کے ۹۴۱،۷۴ ایکڑ زمین حاصل کی گئی اور ۲۵ فی صد رقم یعنی ۲۰ لاکھ روپے ادا کر کے ۵۶۷،۳۲ ایکڑ سرکاری زمین کا سودا کیا گیا۔ اس میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت زمین سرکاری طور پر سوسائٹی کے حوالہ نہیں کی گئی تھی۔ لیکن ممبروں کو ۲۰ روپے فی گز کی شرح سے اس کی الاٹمنٹ پہلے ہی شروع کر دی گئی۔

سوسائٹی نے ۳۰ جون ۱۹۶۷ء تک زمین کی قیمت کی صورت میں ایک لاکھ ۷ ہزار ۳ سو روپے وصول کئے۔

۳۰ جون ۱۹۶۸ء میں یہ رقم بڑھ کر ۹ لاکھ ۳ ہزار ۴ سو ۹۰ روپے ہو گئی۔ ۳۰ جون ۱۹۶۹ء میں یہ رقم ۵۸ لاکھ ۶۴ ہزار ایک سو ۲۸ روپے ہو گئی۔ آڈٹ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ سوسائٹی نے میر نواب خان کو ۳۵ لاکھ ۹۵ ہزار ۱۶ روپے کی ادائیگی کی۔ اس کے علاوہ سوسائٹی نے مسٹر عبدالستار کو ایک لاکھ ۱۹ ہزار ۶ سو ۵۰ روپے اور مسٹر غلام رسول کو ۳ لاکھ ۷۰ ہزار روپے کی ادائیگی کی گئی۔ ان پارٹیوں نے متعلقہ حکام سے باقاعدہ اجازت لئے بغیر سوسائٹی سے اپنی زمین کا سودا کر لیا۔

بنک بیلنس

سوسائٹی نے مختلف بنکوں میں اپنا کھاتہ کھول رکھا ہے۔ وقتاً فوقتاً ان بنکوں میں سوسائٹی کا فنڈ جمع کرایا گیا۔ اس میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ سرکاری بنکوں پر کمرشل

کیش میمو غائب
کیش بک غلط
اور سوسائٹی کا
دھندا جاری

بنکوں کو ترجیح دیا گیا۔

سوسائٹی کے ممبران

۶۷-۱۹۶۶ء میں سردار محمد اسحٰق صدر، سید فصیح اقبال چیئرمین تھے۔ کمیٹی میں چودھری امداد علی، مسٹر کے۔ ایل گابا، میر دین محمد، مسٹر رشید جونیئر اور میر محمد عارف تھے۔ جبکہ خازن کے عہدے پر سید جمال خان تھے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں سردار محمد اسحٰق دوبارہ صدر اور کمیٹی کے چیئرمین بنے۔ سید فصیح اقبال وائس چیئرمین اور کمیٹی کے ممبر بن گئے۔ جب کہ چودھری امداد علی مسٹر دین محمد، مسٹر رشید جونیئر اور محمد عارف ممبران رہے۔ میر جمال خان ممبر اور خازن تھے۔ مسٹر کے ایل گابا کمیٹی کے ممبر اور سیکرٹری تھے۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں سردار محمد اسحٰق خان تیسری بار صدر اور کمیٹی کے چیئرمین بنے۔ لیکن ۵ جنوری ۱۹۶۹ء کو استعفیٰ دے دیا۔ سید فصیح اقبال بدستور چیئرمین اور کمیٹی کے ممبر بنے رہے۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں سید فصیح اقبال چیئرمین بن گئے۔ خازن اور سیکرٹری کے عہدے پر سید جمال خان اور مسٹر کے ایل گابا آئے۔ اسی طرح سوسائٹی کے عہدوں پر ایک مخصوص گروپ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ مسلسل کئی سالوں سے چھایا ہوا ہے۔ سوسائٹی کا سالانہ اجلاس ہر سال ہونا چاہیئے۔ مگر گزشتہ تین سال سے سوسائٹی کا سالانہ اجلاس نہیں ہوا۔

سوسائٹی نے سروے، پلاننگ اور حد بندی پر ۹۳ ہزار ۶ سو نو روپے خرچ کر دیے۔ جب کہ اُسے زمین کا حق استحقاق نہیں ملا۔ اگر زمین کے انتظامات نہ ہو سکیں۔ تو سوسائٹی کو ۹۳ ہزار ۶ سو ۹ روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ سوسائٹی نے کے ڈی اے کو "لے آؤٹ پلان" بھیج دیا ہے، مگر اُسے ابھی تک منظور نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود سوسائٹی نے مجوزہ پلان کے تحت اپنے ممبروں کو زمین کا الاٹمنٹ شروع کر دیا ہے۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ سوسائٹی نے اپنے دستور کی کیا کیا خلاف ورزیاں کیں۔

۱۔ شق ۔۱۲: ۔ سوسائٹی کا سالانہ عام اجلاس ہونا چاہیئے مگر سالانہ اجلاس نہیں بلایا گیا۔

۲۔ ذولے نمبر ۱۷۔ پراپرٹی رجسٹر کی باقاعدہ خانہ پُری نہیں کی گئی۔

۳۔ شق ۔۳۷، سیکرٹری کے پاس ۵۰ روپے سے زائد رقم نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن سیکرٹری کے پاس بھاری رقم رہی۔

۴۔ شق نمبر ۳۔ شیڈول "اے"۔ سوسائٹی کا ایریا کراچی ہے۔ مگر اس کے ممبر پورے پاکستان سے لئے جائیں گے۔

جاپان میں جمہوریت کا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے

جاپان میں فسطائیت کی تجدید

جاپانی ناول نگار مشیما کی خُودکشی

فسطائیت کا خون چکیدہ آغاز

یوسف ضیغم

جاپان کے عظیم ناول نگار یوکیو مشیما کی ڈرامائی خودکشی نے جاپان میں دائیں بازو کی مہاسبھائی اور عسکریت پسند تحریک کو نیا خون دیا ہے۔ اس کی خون آغشتہ اور نیم مذہبی ہلاکت نے جاپانی شعور کو دفعتاً جاپانی تاریخ کے جاگیردارانہ اور عسکری عہد کی سہم ناک یادوں میں دھکیل دیا ہے۔ جن ڈرامائی تیاریوں کے ساتھ اس نے اپنی جاں کشی کی اس کے نتیجہ میں جاپانی جمہوریت کا مستقبل تاریک ہوتا نظر آتا ہے۔ دو سال پہلے اس نے بزعم خود اپنے وطن میں مارکسیت کے ہمہ گیر شجر کی بیخ کنی اور شہنشاہ کے اقبال کو دوبالا کرنے کیلئے ایک نجی فوج بنائی تھی۔ جو تقریباً دو سو سر بازوں اور فدائین پر مشتمل تھی۔ یہ مٹھی بھر سپاہ مشیما کی ڈیزائین کردہ اور بیش بہا وردیاں پہنتی تھی۔ مشیما کا خیال تھا کہ یہ نہایت آزمودہ کار فوج جس کا وہ خود سالار تھا، مستقبل قریب میں جاپان کی خود دفاعی فوجوں کی پیشوائی کا مقدس فرض ادا کرے گی جاپان کی موجودہ دفاعی فوج دو لاکھ انتالیس ہزار نیم تربیت یافتہ اور جدید ہتھیاروں کے لحاظ سے لبضاعت سپاہیوں پر مشتمل ہے، دنیا کی تیسری بڑی معاشی قوت ہونے کے باوجود جاپان اپنی اس فوج پر اپنے مجموعی لقریکی اخراجات سے بھی ایک ادب ڈالر کم خرچ کرتا ہے۔

جاپان کی عسکری پسماندگی کا سبب جنرل میک آرتھر کا منظور کردہ جاپانی آئین ہے۔ اس آئین کی دفعہ 9 کے مطابق جاپانی قوم، دوسری جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد، مدافعی جنگ کے حق سے جو ہر خود مختار اور مقتدر قوم کا حق ہوتا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دست بردار ہوگئی تھی۔ اسی دفعہ کی دوسری شق کے مطابق جاپانی قوم کو کسی بھی بری، بحری یا فضائی فوج کے قیام کے حق سے یکسر محروم کر دیا گیا تھا۔ مشیما جاپان کی عسکری پسماندگی سے آزردہ تھا۔ وہ جاپان کو دنیا کی ایک پُرعزم اور زبردست فوجی طاقت دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنے نقطہ نظر کے متفقین کی تعداد بڑھانے کے لئے اس کے ذہن میں ایک خونی منصوبہ تھا جس کو وہ اتمام حجت کے طور پر بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ جاپانی عوام اور فوج سے اپنے موقف کی تائید حاصل کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ .... چنانچہ کر اور دھوئیں سے پاک نومبر کی ایک آفتابی صبح کو وہ اپنے دو ساتھیوں کے جلو میں جاپان کی بری فوج کے دفتر پہنچا۔ وہ جاپان کی خود دفاعی فوجیوں سے آخری بار خطاب کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ گمان کرتا تھا کہ اس کے حسن التماس سے متاثر ہوکر سرکاری فوجیں حکومت سے سرکشی پہ بالآخر رضامند ہو جائیں گی۔ اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے گیریژن کمانڈر سے ملا۔ وہ اپنے دونوں ہم جلیسوں کے ساتھ جو اسی کی طرح سفید دبراق وردی میں ملبوس اور تیغ بردار تھے۔ جنرل کے کمرے میں داخل ہوا۔ جنرل مشیما کو پہلے سے پہچانتا تھا۔ مشیما نے داخل ہوتے ہی اپنی نیام سے اپنی سبز قدم تلوار نکال کر جنرل کو دکھاتے ہوئے پوچھا "اچھی تلوار ہے نا" یہ سمجھتے ہوئے کہ مشیما محض ٹھٹھول کر رہا ہے۔ کمانڈر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ تلوار کی برہنگی ایک قسم کا خفیہ اشارہ تھا جس کے ملتے ہی مشیما کے دونوں ساتھی جنرل پر ٹوٹ پڑے اور اس کو کرسی سے باندھ دیا۔ باہر کھڑے ہوئے محافظوں کو دفعتاً کمرے میں ہونے والی سنگین صورت حال کی بھنک سی پڑی اور وہ فوراً جنرل کے کمرے میں داخل ہو گئے مگر اس مبارزت آرائی میں آٹھ محافظین اپنی جان گنوا بیٹھے۔ اس کارروائی کے بعد ان تینوں نے کمانڈر کو یرغمال بناکر، اور کمرے کو اندر سے بند کر کے مطالبہ کیا کہ فوجیوں کو پریڈ گراؤنڈ میں مشیما کی تقریر سننے کے لئے اکٹھا کیا جائے۔ اس مطالبہ کے جواب میں بالکونی سے نیچے کوئی بارہ سو فوجی جمع ہو گئے۔ اور پولیس بھی آگئی۔ مشیما بالکنی پہ تقریر کرنے کے لئے نمودار ہوا۔ اس سنگین لمحے کے فریم میں وہ مشہور کاکی کپڑی لباس میں ملبوس تھا۔ اس کے خشخشی سر کے گرد بندھا ہوا فیتا ہوا کے تموج سے لہرا رہا تھا۔ اس نے خطبہ شروع کیا تو اس کی آواز مجمع کے شور وغوغا میں دب کے رہ گئی چنانچہ اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا "میری بات سنو! میں چار سال تک اس انتظار کی زیاں کاری میں مبتلا رہا کہ تم بالآخر حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرو گے۔ تم کیسے بہادر ہو جو ایک ایسے آئین کے تحفظ کے لئے سربکف ہو کر جس نے جاپان کو، عسکری طور پر قطعی مفلوج کر دیا ہے۔ آؤ ہم سب ملکر اس ہمالیہ کی سربلندی کے لئے جنگ کریں جو ہم سب کی ذاتی زندگیوں سے ارفع اور ارجمند ہے۔ یہ دعوت جمہوریت یا حریت کی لڑائی کے لئے نہیں دی جارہی ہے بلکہ جاپان عظیم کے لئے دی جارہی ہے۔ جو ہم سب کے لئے ہم سب سے اہم ہے" ــــ فوجیوں کا ردعمل بلا کا ہمت شکن تھا۔ انہوں نے بالکنی پہ کھڑے مشیما کو احمق اور غبی جیسے خطابات سے نوازنا شروع کیا۔ مشیما نے اپنے سفید دستانوں والے ہاتھوں کے اشارے سے ان دریدہ دہنوں کی چیخ ولپکار کو روکنے کی کوشش کی مگر اس کو کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔ اس کو احساس ہو گیا کہ اتمام حجت مکمل ہو چکا ہے۔ "ہم آئین کے خلاف اپنے احتجاج کا اظہار خودکشی کی صورت میں کر رہے ہیں۔ شہنشاہ جاپان پائندہ باد"، مشیما اپنی پبلک زندگی کے یہ آخری جملے ادا کر کے اپنے انیسوں کے ساتھ جنرل کے کمرے کی طرف لوٹ گیا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد مشیما خوف سے لرزتے ہوئے جنرل کے سامنے کمر تک برہنہ ہو گیا۔ اور زانو کے بل بیٹھ کر جھک گیا۔ اس آس کے دمز کو بھانپتے ہوئے جنرل نے چلاتے ہوئے کہا "للہ یہ مت کرو، حماقت سے باز آؤ" مشیما نے ان کی التماس کی قطعی پرواہ نہ کی اور نیام سے ۱۱

چھرا نکال کر اپنے پیٹ میں دستہ تک بھونک لیا۔ اس کے فوراً بعد مشیما کے ایک ساتھی نے چھرے کو مشیما کے پیٹ سے کھینچ کر نکال لیا اور ایک ہی وار میں مشیما کا سر تن سے جدا کر دیا۔ مشیما کا سر کمرے میں بچھے قرمزی قالین پر لڑھک گیا۔ اس کارروائی کے بعد اسی ساتھی نے وہی ۔۔۔ چھرا

اپنے پیٹ میں بھی بھونک لیا۔ اور پھر اس کے بچے ہوئے تیسرے ساتھی نے اس کا سر بھی قلم کر دیا اور پھر اس کے بعد اس نے ان دونوں سر بریدہ جسموں پر سلام پھیرا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

مشیما کی اس "خوش انتظامی" نے اس کو راتوں رات، جاپان کے کلچرل ہیرو کے درجہ سے ترقی دلوا کر جاپان کا "سیاسی منصور" بنوایا۔ گو یا جاپان کے پیشہ ور اور سر بر آوردہ سیاست کاروں نے پہلی فرصت میں اس خودکشی کو ایک مجذوب اور سنکی رئیس زادے کا ذاتی فعل کہہ کر ٹالنے کی پوری کوشش کی مگر اس کا کیا کیجئے کہ جدید جاپان کی تاریخ میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد یہ تیسرا المیہ ہے جس نے جاپانی ضمیر کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ کچھ اخبارات نے یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کی کہ مشیما اور اس کے نوخیز ساتھی کی مشترکہ خودکشی محض دو ہم جنس پرستوں کے بدقسمت معاشقے کا آخری باب تھی۔ اس عجوبہ تفسیر کے باوجود اس واقعہ نے جاپان کے سیاسی افق پہ ناقابلِ محو اثرات مرتسم کئے ہیں۔

مشیما ایک ایسا شخص تھا کہ جس کی ادبی قامت جاپان میں سب سے ذی فراز تھی۔ اس نے پینتالیس سالہ پر آشوب زندگی میں بیس ناول، تین درجن ڈرامے، ایک سفرنامہ اور چھ درجن سے اوپر مختصر کہانیاں اور ان گنت انشائیے لکھے تھے۔ وہ ایک ہفت پہلی شخصیت کا مالک تھا وہ جدید جاپان کا بیش بہا ادبی متاع تھا۔ اس کی تخلیقات میں فلموں کے اسکرپٹ اور نوہ ڈراموں سے لیکر طالقوں کے نشاطیے تک شامل ہیں۔ وہ یوکیو مشیما کے نام سے اپنی کلاکارانہ زندگی میں داخل ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے آفتاب فن کی شوکت نے پورے جاپان کو ڈھک لیا۔ وہ اسٹیج کا گلوکار فلموں کا ہدایت کار اور اداکار بھی تھا۔ خودکشی کے محض ایک ہفتہ قبل اس نے اپنا چہار تن ناول "بحر زرخیز" مکمل کیا تھا۔ یہ نام اس نے چاند پہ دریافت شدہ زمہریری اور بے آب سمندروں پر رکھا تھا۔ اس ناول میں اس نے پچھلے چھ عشروں میں گھری ہوئی جاپانی زندگی اور تہذیب کو اپنی زخش زاد نثر کی ابدیت میں محصور کیا۔ اس ناول میں اس نے جاپان کی اشرافیہ اور نودولتیے طبقہ کی خوفناک آویزش کو بڑی فنکارانہ معجز بیانی سے قلم بند کیا تھا۔ وہ ثقافتی پسماندگی کو نودولتیت کا ہی فیض سمجھتا تھا۔

مشیما کی ذات جاپانی تاریخ کے جمالی اور جلالی دونوں قوتوں کا سنگم تھی۔ مردانہ اوصاف اور تیور سے اس کے غیر معمولی شغف کی بنا پر اس کو جاپانی ہیمنگ وے کہا جاتا رہا ہے اس شہرت کی ایک وجہ اس کی جسمانی مقابلوں اور خارجی چیزوں میں جنون کی حد تک پہونچی ہوئی دلچسپی تھی، وہ وزن برداری کیرِوت اور کینڈون نامی کھیلوں میں (جو سومورائیا کے سورماؤں کا محبوب فیشن تھا) بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ سخت کوشی کی طرف یہ رومانی میلان جاپان کے ہر طبقہ میں موجود ہے جاپان میں نکیوڈ نامی چوروں اور جواریوں کا ایک ایسا گروہ اب بھی موجود ہے جو اپنی پشت پہ مختلف چہرے اور نمونے گردن

وہ جاپان کو ایک عظیم فوجی طاقت میں دیکھنا چاہتا تھا

سے رے کر سر بن تک کھدواتا ہے، جاپانی آج بھی المیہ اور خودکشی کے تھیمس سے مریضانہ حد تک لگاؤ رکھتے ہیں، یہ منفی لگن ان کو جاپان کے قرون وسطیٰ سے ورثہ میں ملی ہے جاپان کے عظیم فنکار خودکشی اور دیوانگی کو ہی ذہن کی سب سے ابھر مندانہ کیفیتیں سمجھتے رہے ہیں۔ اپنے عظیم پیشرو ڈسل کی طرح پر تخیل موت مشیما کے لئے بھی بے اندازہ کشش رکھتی تھی۔ خود اس کے مطابق موت انسانی تخیل کی عمیق ترین سطح ہے۔ وہ جسم و جاں کی شدتوں کا آدمی تھا۔ سرشتاً راہب ہونے کے باوجود اس کی تحریروں میں اس کی عذاب کشش اور سرگشتہ روح کی شہوت، دہشتناکی اور موت سے بے پناہ شیفتگی کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں ۱۹۶۵ اور میں "وطن پرستی" نام کی اپنی کہانی کو فلم بند کیا تھا اور خود ہے اس فلم کا ہیرو بھی بنا تھا۔ اس نے اس فلم میں ایک جوان لیفٹیننٹ کا کردار کیا تھا۔ جو بغاوت میں ناکامی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ تمام شب ہم بستری کرنے کے بعد خود کو ہلاک کر لیتا ہے اور اس کے بعد اس کی بیوی بھی شدت غم سے خودکشی کر لیتی ہے۔ مشیما ذاتی طور پر محبوبہ کی عاشق کی موت میں شراکت کو وفا کی اعلیٰ ترین شکل سمجھتا تھا

وہ شہرت اندوزی کی بے پناہ ہوس میں مبتلا تھا اس اشتہا کی تسکین کے لئے وہ عجیب وغریب حرکتیں کیا کرتا تھا جاپان کے حساس لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی ان حرکتوں سے محظوظ یا چراغ پا ہوا کرتے تھے "رنگینی کی مشہوری کے لئے" اس نے کچھ مہینوں پہلے لڑکوں کے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں اپنی مادر زاد برہنہ تصویروں کی نمائش بھی کی تھی۔ گزشتہ خزاں میں اسنے جاپانی پبلشر کی اس درخواست کو قبول کر لیا تھا کہ وہ پندرہ قسم کی مختلف ہلاکتوں کے پوز پر کا موڈل بنے۔ ان مختلف پوزوں میں ڈوب کر مرنے، اور ہاراکیری سے ہلاک ہونے کے مناظر بھی شامل تھے۔

وہ اپنے خوابوں کا گرفتاری تھا، وہ مقدس شہنشاہ" کے لئے اپنی جان وارنا چاہتا تھا۔ ایک ہیرو کی طرح موت سے ہم کنار ہونا اس کا سب سے عزیز خواب تھا۔

وہ ایک ایڈیسٹو کریٹ جاپانی کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک جاگیردارانہ اقدار، جدید صنعتی قدروں (بشمول اشتمالی قدروں کے) کے مقابلہ میں زیادہ شریف اور ارجمند تھیں، ہر بورژوا الضاف تعلیم کا حقیقی مقصد عوام کو اس خوش گمانی میں پختہ کرنا ہوتا ہے کہ طبقاتی تقسیم نہ صرف فطری ہے بلکہ مشیت الٰہی کے عین مطابق بھی ہے۔

افلاطون سے لے کر نیٹزے یہاں تک کہ جارج سینیانہ نے بھی فکری سطح پر انسانی سماجوں کو غیر فطری طبقات (چاہے ان کی بنیاد، معاشی ہو یا ثقافتی) میں منقسم کرنے کی مذموم سازش میں اپنے عہدوں کے مخصوص تہذیبی اور لسانی محاوروں کے ذریعے نہ صرف حصہ لیا ہے۔ بلکہ ان کو شیلائٹر بھی کیا ہے۔ استحصالی نظام تعلیم کا ایک مقصد طلبا کو اس اتباع میں یقین کی حد تک مبتلا کرنا ہوتا ہے کہ چند شریف زدمیں یا ہیروز اس لئے پیدا ہوتے ہیں تاکہ وہ انسانی سماجوں کی اندھی اور بے مغز اکثریت کی پیشوائی اور آقائیت کا الوہی فریضہ ادا کریں۔ عوام کا یہ پیدائشی فرض ہے کہ وہ ان مافوق البشر روحوں کے روبرو خود کو حقیر اور فرومایہ محسوس کریں ہر بورژوا —— معاشرہ میں تہور اور دلاوری کو مقدس قدر کے طور پر اپنایا جاتا ہے۔ جب دو بورژوا سماجوں میں جنگ ہوتی ہے۔ تو یہی دلاور اور ہیرو استحصال طبقہ کے مفادات کے تحفظ کا ضروری ایندھن بنتے ہیں۔ چنانچہ مشیما کی تربیت بھی سخت کوش منضبطوں پر ہوئی تھی۔ اسکو لڑکپن ہی سے ان دلاوروں والی موت کی ہوس تھی، ایک ایسی جان وری اور ہلاکت جس سے استحصالی کش عوام کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ شروع جوانی میں جب مشیما کو اس کی لگ بدنی کے باعث فوج میں نہ لیا جا سکا تو اس کو اس کا بہت رنج ہوا تھا مشیما نے بتدریج ورزشوں کے ذریعے اپنا بدن اس قابل بنالیا کہ وہ مقدس قربانی کا سزاوار سمجھا جاسکے۔

گو مشیما نے اپنا پہلا ناول انیس سال کی عمر میں لکھ ڈالا تھا مگر "ایک مصنوعی چہرے کے اعترافات" نامی ناول اس کی آفاق گیر شہرت کا پہلا سنگ میل ثابت ہوئی۔ یہ اس نے ہم جنسیت کے موضوع پر لکھا تھا۔ اس موضوع سے اس کو بے پناہ انس تھا۔ اور کچھ نقادوں کے خیال میں وہ خود بھی اس کجروی کا شکار تھا۔ وہ ہر رات تقریباً نصف شب کے وقت اپنی روزانہ کی آوارگی سے فارغ ہو کر جب اپنے گھر پہنچتا تو گرم غسل لیکر لکھنے کے لئے بیٹھ جاتا اور پھر پو پھٹنے تک لکھتا رہتا۔

جدید جاپان کا روحانی انحطاط اس کا سب سے بڑا ذاتی مسئلہ تھا۔ اس کے خیال کے مطابق یہ زہر مغربی طرز معاشرت اور مارکسی آدرشوں نے پھیلایا تھا۔ اس طرح ثقافتی حوالوں سے ان کا سلسلہ ایلیٹ سے ملتا ہے اور سیاست کی اقلیم میں وہ شیخ مجیب کے ہم مسلک نظر آتے ہیں۔ قوم پرستی کی ہر تاریک جو اشتمالیت آشنا نہیں ہوتی اس کی تان بالآخر نیشیت اور سامراجیت پر ٹوٹتی ہے مشیما کی موت جاپان کے توسیع پسند ارادوں کا ایک واضح پیش نشان ہے۔ جاپان آج وطنیت کی اس حد آخر پر کھڑا ہے جہاں سے فیشیت کی اندھی گلی شروع ہوتی ہے۔ جاپان جدید میں جاپانی نسل، خون اور زبان کو برتر سمجھنے کا جنون وہی شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جو جاپان میں دوسری جنگ عظیم سے پہلے اور اس کے دوران پایا جاتا تھا۔ جاپان میں انتہا پسندوں کا وہ گروہ مقبول ہوتا جا رہا ہے کہ جنکا موقف یہ ہے کہ جاپان کے معاشی مفادات کی توسیع کے لئے ایک بہت بڑی فوج کا ہونا بہت ضروری ہے۔ مشیما اسی گروہ کا فکری باپ تھا۔

اس مسموم رجحان کے دباؤ سے جاپان کے ارباب اقتدار بھی اب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ہم کو ہر لوزع، مشیما کے مثالیہ اور مشن کا احترام کرنا چاہیے۔ آج کا جاپان مشیما کی شان میں قصیدہ پڑھنے والوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک حضرت نے جوش تولا میں یہ تک کہہ دیا کہ وصال مسیح کے بعد تاریخ کا سب سے علم آشنا حادثہ مشیما کی شہادت ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ جس طرح جاپانی عسکریت پرستوں نے قدیم سومیرائی اخلاقیات کو فاشی ضابطہ اخلاق میں بدل ڈالا تھا۔ اسی طرح مشیما کا عسکری عظمت والا مثالیہ بھی اپنے عملی ابلاغ میں عوام دشمنی اور سامراجیت کے خون آشام سیلاب کی شکل اختیار کرے گا۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے کہ جاپان اپنی مہتم بالشان معاشی اور صنعتی استعداد کے گھمنڈ میں اگر چین سے ٹکرانا چاہتا ہے جو فی الوقت تمام افرو ایشیائی اور لاطینی امریکہ میں چلنے والی عوامی تحریکوں کا سرچشمہ ہے

یہ امر قرین قیاس ہے جاپانی سماج کی عوام کش قوتیں مشیما کی روحانی خودکشی کے چیک کو اپنے مفادات کے استحکام کے لئے جلد سے جلد کیش کرانا چاہیں گی اور یہ خدشہ ہر آن موجود ہے کہ مشیما کی ہلاکت کو آنے والے عہدوں میں جاپان کی نو فاشیت کے خون چکیدہ "پیش لفظ" کے طور پر یاد کیا جائے۔

مزدور کسان پارٹی کے صدر اسحاق محمد سے ایک

پاکستان کے قومی مُفادات کو سامراجیوں کی

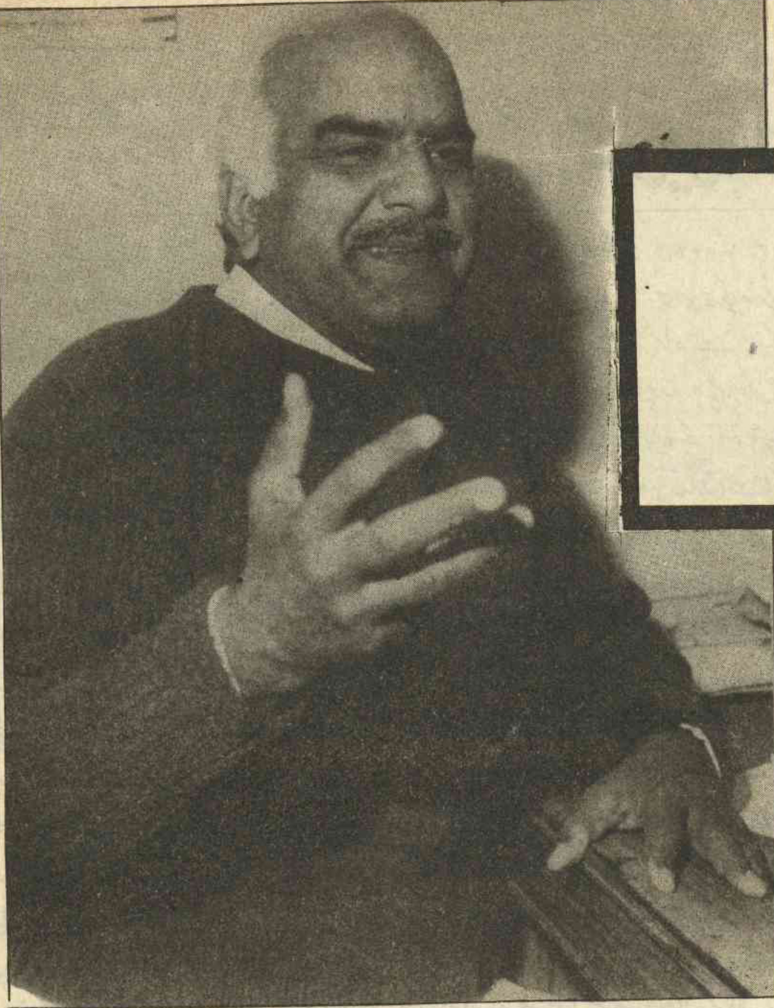
ہشت نگر کی تحریک پاکستان کی تاریخ میں اپنا مقام بنا رہی ہے۔ سرحد کے ظالم خوانین کے خلاف باشعور اور منظم کسانوں کی انقلابی جدوجہد فتح کی منزل تک جاری رہنے کے لئے شروع ہو چکی ہے۔ یہ قافلہ آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرے گا۔ جیل کی سختیوں اور دار و رسن کی خونچکاں داستانوں سے اپنی تاریخ مرتب کریگا۔ یہ قافلہ اپنی منزل سے پہلے نہیں رُکے گا۔ اس لئے کہ یہ قافلہ ان لوگو پر مشتمل ہے جو زمین کو اُس کے جائز وارثوں، یعنی کسانوں اور ہاریوں اور کارخانوں کو اُن ہاتھوں کے حوالے کرنا چاہتے ہیں جن کے دم سے ملوں اور کارخانوں کے دل دھڑکتے ہیں اور چمنیوں سے دھواں نکلتا ہے۔ یہ مزدور اور کسان اپنا قائد خود چنتے ہیں۔ ہشت نگر تحریک کے پہلے مرحلے میں اسحاق محمد، افضل بنگش، لالہ زیارت گُل اور بہت سے انقلابی رہنما شامل ہیں۔ مزدور کسان پارٹی کے صدر اسحاق محمدؔ اُن رہنماؤں میں سے ایک ہیں جو پاکستان کو انقلابی بنیادوں پر منظم کرنا چاہتے ہیں۔ اب تک اس راستے میں انہوں نے سختیاں اور مصائب جھیلے۔ یحییٰ دَور میں اُنھیں خطرناک قرار دے کر پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ مگر استحصالی مشینری کے اس رویے سے تحریک کو کُچلا نہ جا سکا۔ وہ اسحاق محمد اور دیگر رہنماؤں کی عدم موجودگی میں بھی چلتی رہی۔ بلکہ شدّت اختیار کر گئی کیونکہ تحریکیں وہی زندہ رہتی ہیں جو افراد پر نہیں بلکہ نظریہ اور اصولوں پر چلتی ہیں۔

"پاکستان کے قومی تقاضوں کو سامراجیوں کے عالمی تقاضوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔" یہ بات جناب اسحاق محمدؔ نے ایک مُلاقات کے دَوران بتائی۔ اس ایک جملہ میں انہوں نے پاکستان کی ۲۴ سالہ استحصالی تاریخ کو سمو دیا۔ وہ تاریخ جو استحصالی طبقوں اور فوجی آمروں نے مرتب کی ہے، جو محنت کشوں کے لہُو سے رنگین ہے۔ یہ تاریخ بڑی ہی خونچکاں اور دُکھ درد سے بھری ہوئی ہے۔ جناب اسحاق محمد موجودہ صورتِ حال میں پاکستان کا سب سے اہم تضاد بتا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ "دنیا کے دُوسرے پس ماندہ ملکوں کی طرح پاکسان کی معیشت نیم نوآبادیاتی اور نیم جاگیردارانہ ہے۔ پاکستان کا بنیادی مسئلہ عوامی جمہوری انقلاب برپا کرنا ہے۔ یہ تو ایک عمومی بات تھی۔ اس کے تحت پاکستان کے مخصوص پس منظر اور جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے آج جو سب سے بڑا اور اہم مسئلہ درپیش ہے وہ اس کی بقاء یا فنا کا ہے۔ ملک کے دو ٹکڑے ہو جانے کے بعد ہر پاکستانی یہ سوچ رہا ہے کہ آیا مغربی پاکستان ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے قائم رہ سکے گا، یا نہیں۔ کچھ لوگ اس چیز کو میکانکی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ہمارا سب سے بڑا تضاد ہندوستان کی توسیع پسندی کے ساتھ ہے جس میں روسی سوشل سامراج ہندوستانی حکمرانوں کی حمایت کر رہا ہے"

انہوں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "۱۹۴۷ء میں ہمیں جو آزادی ملی وہ ادھوری تھی۔ انگریز کی فوجیں اور اس کی انتظامیہ کی مشینری تو ہٹا دی گئی۔ لیکن اس کا چھوڑا ہوا مشینی ڈھانچہ جوں کا توں رہا۔ سیاسی، انتظامی، ثقافتی، تعلیمی، فوجی، قانونی اور تمام امور میں انگریز کی نقالی جاری رہی، ہم عالمی سامراجی منڈی میں جکڑے رہے۔ ہماری نیم آزادی کو بہت بڑا ضعف اس وقت پہنچا جب ہمیں فوجی معاہدوں کے ذریعے سامراجی جکڑ بندیوں میں کس دیا گیا۔ اور ہماری قوم کے اندرونی اور بیرونی معاملات کلی طور سامراجی جکڑ بندی میں آ گئے۔ پاکستان کے قومی تقاضوں کو سامراجیوں کے عالمی تقاضوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ہندوستان



وہاب صدیقی اسحاق محمد سے انٹرویو لے رہے ہیں



بلینٹ چڑھا دیا گیا

ب صدیقی

کی طرف سے ہماری سالمیت کے خطرے کو اسی سیاق و سباق میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لینن نے کہا ہے کہ "صحیح معنوں میں جدلیات اشیاء کی اصل اساس کے اندر موجود تضاد کے مطالعہ کا دوسرا نام ہے"۔ ایک معیشت میں اس تضاد کو پیداواری قوتوں اور پیداواری رشتوں کے درمیان تضاد کا نام دیں گے۔ اس اصول کی روشنی میں اپنے ملک کے گذشتہ ۲۴ سالہ دور پر نگاہ ڈالیں۔ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ سامراجیوں اور ان کے جاگیردار اور سرمایہ دار حواریوں نے اوّل تو پاکستان کے محنت کشوں کے بے محابا استحصال کے لئے ——— ان پر انتہائی تشدد کیا۔ عوام پر ظلم کی تاریکی چھائی رہی۔ اور پاکستان کو ان کے خوابوں کی جنت کی بجائے ان کے لئے ظلمت اور غم کا مقام بنا دیا گیا۔ دوم یہ کہ کراچی اور پنجاب کے استحصالی طبقوں کی سہولت کے لئے ون یونٹ بنا کر اور مشرقی پاکستان کو اقتدار میں شریک ہونے سے باز رکھ کر یہاں مرکز گریز رجحانات کو تقویت دی گئی۔ سوم یہ کہ انگریزی زبان اور کلچر کی برتری قائم رکھ کر پاکستان میں ایک قومی شعور کی ترقی و ترویج میں رکاوٹ پیدا کر دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی میں لاکھوں پاکستانیوں کی جانیں گئی ہیں اس جانکاہ واقعہ کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ اس سے نہ صرف ہندوستانی توسیع پسندوں کو پاکستان کے دو ٹکڑے کرنے میں مدد ملی۔ بلکہ مشرقی پاکستان کے عوام بھی استحصالی طبقوں کے چنگل میں بدستور جکڑے رہے ہیں"۔

انہوں نے کہا کہ "ان حالات میں میں تو یہی کہوں گا۔ کہ پاکستان کا سب سے اہم تضاد اندرونی ہے یہاں کے عوام کا سامراجیوں، جاگیرداروں، گماشتہ سرمایہ داروں اور افسر شاہی کے ساتھ تضاد ہے اور

سیٹو سنٹو کی تجدید کی باتیں۔ قومی مفاد کے خلاف ہیں

جب تک عوامی جمہوریت کی شکل میں حل نہیں ہوتا پاکستان کی بقاء و استحکام کو ہندوستانی، روسی، امریکی، برطانوی، ایرانی، افغانی ہر طرح کی ریشہ دوانیوں سے خطرہ لاحق رہے گا۔ ہمارے حالیہ قومی المیہ نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان کا وجود جاگیردار اور سرمایہ دار حکمرانوں کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پاکستان کے محنت کشوں کو میدان میں آنا ہوگا۔ وہی پاکستان کی بقاء اور استحکام کی ضمانت دے سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت تمام پسماندہ ممالک میں ہونے والی جدوجہد آزادی سے ملتا ہے"۔

جناب اسحاق محمد نے اس سوال کے جواب میں کہ موجودہ حکومت جو اصلاحات کر رہی ہے اس سے وطن عزیز کی انقلابی تحریکیں کس حد تک متاثر ہوں گی کہا کہ "گذشتہ تین سال، چار سال میں پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے ہمارے ملک کے محنت کشوں کی توقعات کو بڑی حد تک اچھالا۔ چنانچہ جب بھٹو صاحب کو اقتدار ملا تو سب کا خیال تھا کہ وہ موجودہ معیشتی ڈھانچہ توڑنے اور نئی سطح پر ملک کی تعمیر نو کے لئے انقلابی اقدامات کریں گے لیکن اب تک سرمایہ داری کے غلبہ کو مٹانے اور مزدوروں کے حقوق کی بحالی کے لئے جو اصلاحات کی گئی ہیں۔ وہ قطعی ناکافی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں عوام میں جو ردعمل ہوا وہ بڑا شدید ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ میں بھٹو صاحب اور ان کے بعض ساتھیوں کے ذہنوں میں غالباً یہ خیال جاگزین ہو گیا تھا کہ بھٹو صاحب کی شخصیت میں اتنی کشش ہے کہ وہ جو کچھ چاہیں گے عوام سے تسلیم کرا لیں گے۔ لیکن پیپلز پارٹی کے اقتدار سنبھالے سو دن بھی نہیں ہوئے کہ یہ بات واضح اور صاف ہو گئی کہ عوام کا شعور بھٹو صاحب اور ان کے ساتھیوں کی توقعات سے کہیں زیادہ بلند ہے اسی عوامی شعور کا نتیجہ ہے کہ جو کچھ اور تھوڑا بہت اصلاحات کے نام پر کیا گیا۔ عوام اس سے مطمئن نہیں۔ ان حالات میں اگر موجودہ حکومت کا مقصد نام نہاد اصلاحات کے ذریعہ انقلاب کو روکنا تھا تو وہ پورا نہیں ہوا حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے المیہ اور اس کے سیاق و

ستان
رحد کے
وں کے
ہوئے
رسے
ف ہیں

جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں پاکستان محفوظ نہیں رہ سکتا

سباق نے ہمارے عوام کے شعور کو بہت تیز کردیا ہے اور اس شعور کی روشنی میں چالاک اور مکار لوگ صاف دکھائی دے رہے ہیں۔"

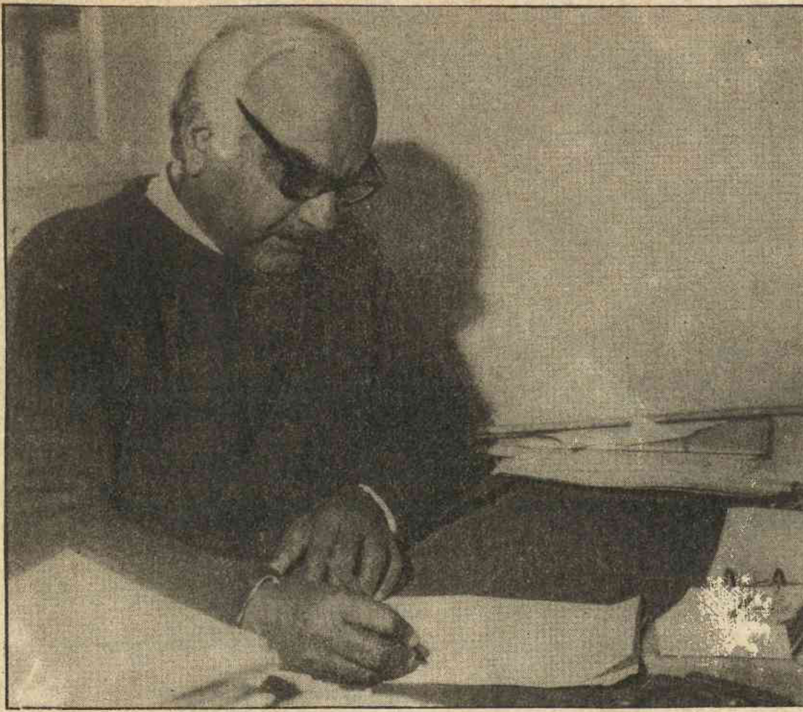
سوال تھا کہ صدر بھٹو سیٹو سنٹو کے رویہ پر نظر ثانی کرنے کی باتیں کررہے ہیں اور امریکی سامراج سے دفاعی معاہدہ کرنے کی پیشکش کی ہے۔ اس کے بارے میں مزدور کسان پارٹی کا موقف کیا ہے؟ جناب اسحاق محمد کہنے لگے "صدر پاکستان مسٹر بھٹو کے بیانات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسی خارجہ پالیسی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جو انہوں نے ایوب خاں کی صوابدید پر بنائی تھی۔ اس پالیسی کو چند الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ کہ جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لئے عوامی جمہوریہ چین سے امداد حاصل کی جائے اور ملک کے اندر استحصالی قدروں کی حفاظت کے لئے امریکی سامراج اور اس کے حواریوں کا سہارا تلاش کیا جائے۔ میرا مطلب ہے کہ اندرون ملک سامراج کے حاشیہ بردار گماشتہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور افسر شاہی کا غلبہ برقرار رکھا جائے۔ سیٹو سنٹو کے رویہ پر نظر ثانی کی بات اسی پالیسی کا حصہ ہے۔ کیونکہ سیٹو، سنٹو کا استعمال ابھی تک پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کی بجائے ملک کے اندر طبقاتی مفادات کے تحفظ کے لئے ہوا ہے۔ سیٹو میں شامل تمام ملک، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فلپائن، تھائی لینڈ، سب نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیا ہے۔ برطانیہ نے تو بنگلہ دیش کی پیدائش میں دائی جنائی کا کام کیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھی سیٹو سنٹو کے معاہدوں کی وجہ سے پاکستان کو کوئی فیض نہیں پہنچا۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ان معاہدوں کا ڈھونگ پاکستانی عوام کو سامراجی غلبہ میں جکڑے رکھنے کے لئے رچایا جارہا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے عوام پر اعتماد کریں۔ عوام دشمن قوتوں کا خاتمہ کریں اور خود انحصاری کی بنیاد پر ملک کا تحفظ کریں۔"

جناب اسحاق محمد نے ایک سوال کا کہ چین پاکستان سے دفاعی معاہدہ کرنے سے کیوں گریز کررہا ہے؟ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "میرے خیال میں چین اور پاکستان کے درمیان جو حکومتی تعلقات ہیں ان کے بارے میں نہ چینی حکومت کو کوئی غلط فہمی ہے اور نہ ہی پاکستانی حکمرانوں کو، ان کے قرب کو بزبان فرنگی STRANGE BED-FELLOWS کہا جاسکتا ہے آج چین دنیا بھر کی سامراج دشمن قومی آزادی کی تحریکات کا سربراہ ہے۔ اس کے برعکس ہمارے حکمران طبقے سامراج کا پروردہ ہیں۔ سامراجی تحفظ کے بغیر ان کی بقاء ممکن نہیں، چین کے ساتھ ہمارے حکمرانوں نے اشد مجبوری کی وجہ سے ریاستی تعلقات قائم کئے۔ ہندوستان کا خوف ان کو چین دوستی پر مجبور کررہا ہے۔ ورنہ وہ ہمہ وقت اس دوستی سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں ایوب خان نے ہندوستان کو دفاعی معاہدے کی پیشکش کی۔ ۱۹۶۵ء میں پاک ہند جنگ کے موقع پر چین نے بڑے کھلے اور اعلانیہ انداز میں پاکستان کی حمایت میں مداخلت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو جہاں امریکہ، روس اور ہندوستان کانپ گئے، وہاں ایوب بھی تھرتھرا اٹھا۔ اور چین کی حکومت سے بالا بالا اس نے امریکہ، روس کی ملی بھگت سے معاہدہ تاشقند کرلیا۔ حالیہ جنگ میں بھی اس بات کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں کہ جنگی صورت حال کے بارے میں پاکستانی حکمرانوں نے چینی حکومت کو بے خبر رکھا۔ اور اب تو چواین لائی نے واضح کردیا ہے کہ چینی اسلحہ بیرونی جارحیت کے خلاف تو استعمال ہوسکتا ہے لیکن پاکستانی عوام کے خلاف نہیں، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے جاگیردار اور سرمایہ دار حکمران عوام کو تشدد کے بغیر دبا سکتے ہیں؟۔ یقیناً وہ تشدد کے بغیر عوام کو دبا نہیں سکتے۔ اس لئے ان حالات میں چین اور پاکستان کے درمیان دفاعی معاہدہ خارج از امکان ہے۔"

آپ کی پارٹی نے انتخابات کو عوامی مسائل کا حل قرار نہ دیتے ہوئے انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔ مگر سرحد میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت کی کیا اس طرح مزدور کسان پارٹی نے انتخابات میں بالواسطہ حصہ نہیں لیا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے۔ مسٹر اسحاق محمد نے بتایا کہ "انتخابات میں حصہ لینا یا نہ لینا ہمارے ایمان کا جزو نہیں، مزدور کسان پارٹی نے انتخابات میں اس لئے حصہ نہیں لیا تاکہ اپنے کارکنوں کو یہ بات ذہن نشین کراسکیں کہ نیم نوآبادیاتی اور نیم جاگیردارانہ معیشتی ڈھانچہ کی موجودگی میں انتخابات کے نتائج کا استحصالی طبقوں کے حق میں جانا لازمی اور ناگزیر ہے۔ اس لئے ہمیں اس مسئلہ میں انتخابات کے نتائج کا استحصالی طبقوں کے حق میں جانا لازمی اور ناگزیر ہے۔ اس لئے ہمیں اس مسئلہ میں سردردی کی وجہ یہ تھی کہ ووٹ لینے کے لئے عوام کو یہ بتانا ضروری ہے کہ ان کے ووٹ "قیمتی" ہیں۔ اور "صحیح" ووٹ ڈالنے سے ان کے مسائل حل ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ ہمارا اندازہ تھا کہ حکمران طبقے انتخابات کے نتائج کا احترام نہیں کریں گے۔ ہماری نظریں اس وقت پر لگی ہوئی تھیں جب انتخابات کے نتیجہ میں عوام کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور عوام میں بددلی پھیلے گی جہاں تک مزدور کسان پارٹی کے کارکنوں اور محنت کشوں کے اس حصہ کا تعلق ہے۔ جن کا اعتماد ہماری پارٹی حاصل کرچکی ہے۔ انہوں نے پارٹی کے فیصلے کا احترام کیا۔ ہشت نگر، ٹیلہ بند وغیرہ میں کئی الیکشن بوتھ ووٹروں سے خالی رہے۔ اخبارات میں بھی اس بات کا تذکرہ آیا۔ لیکن ووٹروں کے کچھ طبقے ایسے بھی تھے جو ووٹ نہ ڈالنے کو مصلحت نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ہماری پارٹی پر ان کا اعتماد اس حد تک تھا۔ کہ وہ ہماری پسندیدہ پارٹی کو ووٹ دینا چاہتے تھے۔ ایسے افراد کو ہم نے بتایا کہ وہ پیپلز پارٹی کے ان امیدواروں کو ووٹ دیں جن کا تعلق جاگیرداروں اور استحصالی طبقوں سے نہیں الیکشن کے دوسرے دن ہی میں نے ایک مضمون بعنوان "ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں" لکھا، یہ مضمون ہفت روزہ صنوبر میں شائع ہوا۔ اس میں بڑی تفصیل سے انتخابات کے نتائج کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ اور مستقبل نے ثابت کردیا کہ ہمارا موقف درست تھا۔ حکمران طبقے نے انتخابی نتائج کا احترام نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کا المیہ رونما ہوا۔ مغربی پاکستان میں بھی بحالت مجبوری پیپلز پارٹی کو اقتدار دیا گیا۔"

مزدور کسان پارٹی عوامی جمہوریت کے قیام کی حامی ہے۔ جناب اسحاق محمد نے اپنی پریس کانفرنس میں عوامی جمہوریت کے قیام پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ مزدور کسان پارٹی آئینی طریقہ سے کام کررہی ہے۔ اور آئینی ذرائع پر یقین رکھتی ہے۔ ملاقات کے دوران ان سے پوچھا گیا کہ کیا آئینی ذرائع سے عوامی جمہوریت قائم ہوسکتی ہے؟ اس جواب میں انہوں نے بتلایا کہ "مزدور کسان پارٹی ایک کھلی اور آئینی تنظیم ہے۔ سوال

یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوامی جمہوریت کے قیام کی جدوجہد میں کسی ایسی جماعت کا کردار مفید ہو سکتا ہے یا نہیں؟
میرا جواب اثبات میں ہے۔ اس سلسلے میں جو مفید کام کیا گیا وہ یہ ہے کہ بائیں بازو کی سیاست کی نہج کو کو بدل دیا۔ ہم نے ان طبقوں کے لئے جو عوامی جمہوری انقلاب کی زد میں آتے ہیں، مزدور کسان پارٹی کے دروازے بند کر دیئے، مزدور کسان اتحاد کو اولیت دے رہے ہیں اور ہم یہ بات ذہن نشین کرا رہے ہیں کہ مزدوروں کسانوں، دانشوروں اور نچلے متوسط طبقے کے دوسرے محب وطن افراد کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ قوم کی سیاست معیشت، اور ثقافت کو سامراجی اور جاگیرداری تسلط سے آزاد کرا کر عوامی جمہوری اقتدار قائم کر سکتے ہیں اس کے لئے ہم نے رہنمائی کے لئے صنعتی مزدور کا فلسفہ سیاست یعنی سائنسی سوشلزم اپنایا ہے۔ ہمارا خیال ہے۔ کہ آج اوپر کے مقاصد کے لئے جتنے بھی آئینی ذرائع میسر ہیں ان سے کلی طور پر فائدہ اٹھایا جائے۔
ہم جانتے ہیں کہ استحصالی طبقے مزدور کسان پارٹی کی نشوونما کو برداشت نہیں کریں گے۔ اسے تشدد، ظلم و استبداد کا نشانہ بنائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد محنت کشوں کی جو پارٹی وجود میں آئے گی۔ وہ موجودہ مزدور کسان پارٹی نہیں ہو گی۔ غالباً ہم بھی نہیں ہوں گے ولی خان کے بیانات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکمران طبقوں کے ہوشیار اور چالاک افراد ہماری پارٹی سے انتہائی اور شدید نفرت کرنے لگے ہیں اور اسے تشدد کے ذریعہ دبانے کی فکر میں ہیں۔ بہرحال محنت کشوں کی پارٹی جو مستقبل میں قائم ہو گی وہ پرولتاری فلسفہ سیاست کے مطابق اپنی حکمت عملی مرتب کرے گی۔"
دوران گفتگو ولی خان کا بھی ذکر آیا۔ ولی خان کی مخالفت کی وجہ پوچھی تو جناب اسحاق محمد کہنے لگے کہ "عبدالولی خان مجھے بہت قریب سے جانتے ہیں۔ جب ان کے والد محترم خان عبدالغفار خان مغربی پاکستان نیپ کے سربراہ تھے۔ تو میں اکثر و بیشتر چارسدہ میں ولی خان کا مہمان رہتا تھا۔ دوستانہ مراسم تھے۔ ولی خان اس وجہ سے بھی میری قدر کرتے رہے ہیں کہ میں نے ون یونٹ کی ڈٹ کر اور اعلانیہ مخالفت کی۔ جب کہ ون یونٹ کی مخالفت کرنا کم از کم پنجاب کی حد تک سیاسی خودکشی کے مترادف تھا۔ لیکن یہ تعلقات جلد ہی کشیدہ ہو گئے۔ کئی سال قبل ہی



بھارت کے خوف نے حکمران طبقے کو چین کے قریب کر دیا

عبدالولی خان نے میری اور میرے ساتھیوں کی مخالفت شروع کر دی اس کا سب سے پہلا اظہار ۱۷ مارچ ۱۹۶۸ء کو ہوا۔ جب انہوں نے آمرانہ انداز میں سرحد نیشنل عوامی پارٹی کے دروازے کسان کارکنوں پر بند کر دیئے اس آمرانہ اقدام کے نتیجہ میں مزدور کسان پارٹی معرض وجود میں آئی۔ آج جو چیز ولی خان کو تڑپا رہی ہے وہ یہ ہے کہ سرحد کے وہ ہزاروں کسان جو کسی زمانے میں خدائی خدمت گار تھے۔ اور عبدالغفار خان سے عقیدت رکھتے تھے۔ آج شعور کی اس حد تک بلند ہو گئے ہیں۔ جہاں تک نہ تو خان عبدالغفار خان کی رسائی تھی اور نہ ہی ولی خان اس حد تک جانے کے لئے تیار ہیں ان کے تمام عقیدت مند جو ایک زمانے میں ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ اب ان کی نظر میں "گوریلے" بن گئے ہیں۔ ولی خان مجھ سے اس لئے ناراض ہیں کہ جب ۱۹۶۳ء میں خانیوال میں مغربی پاکستان کسان کمیٹی کی تجدید کی گئی تو مجھے اس کا کنوینر بنایا گیا۔ میں نے سرحد میں کسان کمیٹی کے احیاء میں امداد کی۔ میری یہی بات ولی خان کو بری لگی۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ سرحد میں مزدور کسان پارٹی کی ترقی وہاں کے مخصوص حالات وہاں کے رہنماؤں اور کارکنوں کی انتھک محنت کی مرہون منت ہے اس میں میرا حصہ بہت معمولی ہے۔ لیکن عبدالولی خان ایک پنجابی کو معتوب کر کے نسلی اور علاقائی تعصب کو ہوا دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس نفرت سے سرحد کے کسانوں کے طبقاتی شعور کو کند کرنے کی مکروہ سازش میں مصروف ہیں مقام شکر ہے کہ اس ناپاک اور مکروہ حرکت میں انھیں منہ کی کھانی پڑی۔ اب وہ بغلیں جھانک رہے ہیں۔"

پاکستان میں کسان تحریک کے مستقبل کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "عوامی جمہوری انقلاب میں اصل قوت کسانوں کی ہوتی ہے ہمارے ملک کی نجات کسانوں کو منظم کرنے میں ہے ضرورت اس بات کی ہے۔ کسانوں کو تاریخی کردار کا احساس دلایا جائے۔ ان کے شعور کو اتنا بلند کیا جائے کہ وہ مزدوروں دانشوروں اور نچلے متوسط طبقے کے دیگر عناصر کے ساتھ مل کر ریاستی اقتدار سنبھال لیں۔ تاریخی لحاظ سے کسان سوشلزم کا حامی نہیں ہوتا" زمین ہل چلانے والے کی" کا نعرہ جاگیرداری کا توڑ ہے۔ سوشلزم کی بنیاد نہیں لیکن پس ماندہ ملکوں میں جاگیرداری سوشلزم کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس لئے مزدور کو یہ رکاوٹ دور کرنے کے لئے کسان کی قوت کا استعمال ضروری اور لازمی ہوتا ہے۔ عوامی جمہوریت میں کسان اسی وقت بامقصد کردار ادا کر سکتا ہے جب وہ مزدور کی رہنمائی قبول کرے۔ بالفاظ دیگر ایک ایسی پارٹی

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

ضیاء سرحدی

سامراج کی خدمتِ اقدس میں

بے ذوق ہو چکے ہو
تم حُسن کھو چکے ہو
اب کیا رہا ہے باقی
اب تم نہیں ہو ساقی

بجھنے لگے ہیں ساغر   اب ہاتھ میں تمہارے
اب وقت کر رہا ہے   تم کو یہی اشارے
رختِ سفر اُٹھاؤ
اور میکدے سے جاؤ
اب کیا رہا ہے باقی
اب تم نہیں ہو ساقی

وہ شمع کیا جلے گی   جو شمع جل چکی ہے
وہ رات کیا رہے گی   جو رات ڈھل چکی ہے
تم صبح کیا بنو گے
قسمت سے کیا لڑو گے
اب کیا رہا ہے باقی!
اب تم نہیں ہو ساقی

انسان کے جنوں کی   تفسیر اب نئی ہے
اب خواب سب نئے ہیں   تعبیر اب نئی ہے
اب تم سراب میں ہو
بیدار، خواب میں ہو
اب کیا رہا ہے باقی
اب تم نہیں ہو ساقی

اب طبلِ جنگ تمہارا   تاریخ میں بجے گا
انسان پر تمہارا   اب بس نہیں چلے گا

انسان بدل گئے ہیں
اب یہ سنبھل گئے ہیں
اب کیا رہا ہے باقی
اب تم نہیں ہو ساقی

بددل ہوئے ہیں تم سے   خود نوجواں تمہارے
مرکز سے ہٹ رہے ہیں   کیوں اس طرح ستارے؟
کیا اضطراب ہے یہ؟
اِک انقلاب ہے یہ
اب کیا رہا ہے باقی
اب تم نہیں ہو ساقی

ٹھوکر میں آ چکا ہے   تاجِ زریں تمہارا
ویت نام میں ہُوا ہے   یہ راز آشکارا
اب گمرہِ راہ ہو تم
بارِ نگاہ ہو تم
اب کیا رہا ہے باقی
اب تم نہیں ہو ساقی

اب نزع کا ہے عالم   اب سانس آخری ہے
اب زندگی تمہاری   اِک نقش ظاہری ہے
لرزاں ہو تم خلا میں
شیرازۂ فضا میں
اب کیا رہا ہے باقی
اب تم نہیں ہو ساقی
رختِ سفر اُٹھاؤ
اور میکدے سے جاؤ

ادب کیلنڈر کے حساب سے تخلیق نہیں کیا جاتا

صادق مدہوش کا کلام رئیس امروہوی کا نکلتا یا راغب مرادآبادی کا

الفتح رپورٹ

انجمن ترقی پسند مصنفین کی پندروزہ ادبی نشست' مورخہ ۱۰ر فروری ۱۹۷۲ء کو "قومی ٹانک گھر" کے ہال میں شام کے ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوئی۔ صدارت کے فرائض جناب غلام عباس نے انجام دیئے۔

اس ادبی نشست میں چند دلچسپ ادبی شخصیتیں دیکھنے میں آئیں اور اُن کی دلچسپ باتیں بھی سننے میں آئیں۔ یہ شخصیتیں تھیں سید صادق مدہوش، سیّد جوہر حسین، سیّد مقبول جلیس اور سیّد یوسف کامران۔ ان کی گفتگو کی جھنجلاہٹ، اور برہمی سے یہ اندازہ ہُوا کہ ترقی پسندی سے خدانخواستہ عزت سادات کو خطرہ لاحق ہے۔ برہمی کا آغاز سیّد صادق مدہوش کی دھواں دھار تقریر سے ہُوا۔ رنگ ڈھنگ اُن کے نرالے تھے۔ سُرخی مائل بند گلے کا کوٹ۔ سُرخ بال، سُرخ گھنی مونچھیں اور سُرخ آنکھیں۔ نہایت غیض کے عالم میں بولتے تھے۔ بات بات پر اُلجھتے تھے۔ قدم ڈگمگاتے تھے۔ بار بار کرسی کا سہارا لیتے تھے۔ اُن کی اُلجھن یہ تھی کہ ترقی پسندی کیا ہے؟ لیاری کے مزدور پر نظم کہی جائے تو وہ نہ ترقی پسند ہوگی، نہ نظم ہوگی۔

پچاس پچپن اہلِ قلم کے اس اجتماع میں لوگ ان کو حیرت سے دیکھتے تھے۔ اور دل ہی دل میں کڑھتے تھے کہ اردو زبان بھی کیسی مظلوم زبان ہے جس میں ایسا ایسا ادیب اور شاعر پڑا ہے لیکن جاننے والے جانتے تھے اور زیرِلب مسکراتے تھے جس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کراچی میں ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ سیّد صادق مدہوش بھی ان میں پہنچ جاتے۔ دو ایک بار انھوں نے اپنی غزل بھی تنقید کے لئے پیش کی۔ بحث کی تان ہمیشہ اس مسئلہ پر آکر ٹوٹتی کہ یہ نظم رئیس امروہوی کی ہے یا راغب مرادآبادی کی۔ یہ قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے کہ یہ کلام بلاغت نظام ان ہی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے مگر اُن کی بات قہقہوں میں اُڑ جاتی۔ حکیم یورش سارا بھانڈا پھوڑ دیتے۔ صادق مدہوش حکومت کے نمک خوار ہیں اور دیرینہ نمک خوار۔ ایوب خاں اور یحییٰ خاں کی حکومتوں کو بھگتا چکے ہیں۔ اب خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے میں "نسل بندی" کی پبلسٹی کرتے ہیں

سیّد جوہر حسین ہر ادبی محفل میں جاتے ہیں اور ادیب کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔ پتھر مارتے ہیں لیکن خود پتھراؤ کی زد میں نہیں آتے۔ یوسف کامران کچھ اُس سے بھی سوا نکلے۔ وہ ترقی پسند ادب سے سخت ناراض معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ فیض ہوں یا قاسمی یا کوئی اور تمام ترقی پسند ادیبوں کا احتساب کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کا احتساب تو سننے میں آیا۔ ادیبوں کے احتساب کا شاخسانہ پہلی بار کان میں پڑا۔ کسی دل جلے نے آوازہ کسا، شوق سے احتساب کیجئے لیکن نیک کام کا آغاز ہمیشہ اپنے گھر سے ہوتا ہے۔ بات قہقہوں میں اُڑ گئی۔

غرضیکہ یہ تھے اس ادبی نشست کے چند دلچسپ پہلو۔ اب اس کی روداد سُنیے۔ کارروائی کا آغاز گذشتہ نشست کی روداد سے ہُوا جو بلا کسی ترمیم کے منظور کرلی گئی۔ اس کے بعد محسن بھوپالی نے اپنی غزل تنقید کے لئے پیش کی۔

غزل پر اظہار خیال کرتے ہُوتے علی احمد نے کہا کہ شاعر نے زندگی کی طرف منفی رویہ اختیار کیا ہے۔ ایک احساس بیچارگی و کسمپرسی ہے جو پوری غزل پر چھایا ہُوا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر بیچارگی و کسمپرسی کے اظہار کا نام شاعری ہے تو یہ کوئی اچھی علامت نہیں۔ مایوسی ترقی پسندوں کا شیوہ نہیں۔

سحر انصاری نے علی احمد سے اختلاف رائے کرتے ہُوئے کہا کہ زندگی کی طرف منفی رویہ اختیار کرنا رجعت پسندی نہیں۔ زندگی میں ایسی باتیں بے شمار ہیں جن کی نفی کرنا پڑتی ہے۔ اسی طرح رجائیت اپنی جگہ اچھی چیز ہے نہ بُری۔ رجائیت کی قدر متعین کرنے کے لئے ہمیں دیکھنا پڑیگا کہ اس کا پس منظر کیا ہے۔ انہوں نے غزل کے پہلے شعر کا حوالہ دیتے ہُوئے کہا کہ اس شعر کا تاثر مایوس کن ہے مگر یہ اس مایوسی کا اظہار ہے جو اُن لوگوں میں پھیلی ہُوئی ہے جو جدوجہد سے بہت قریب ہیں۔ شاعر نے ان لوگوں پر طنز کیا ہے۔ یہ اظہار مایوسی برائے مایوسی نہیں بلکہ اظہارِ مایوسی برائے امید ہے۔

حسن عابدی نے سحر انصاری کے خیال کی تائید کی انہوں نے کہا کہ رجائیت برائے رجائیت ہو تو قابل قبول نہیں۔ مایوسی کے اظہار سے اگر امید کی کرن پھوٹی ہو تو اُسے رجعت پسندی نہیں کہا جا سکتا۔

عابد علی نے کہا کہ اب تک جتنی باتیں غزل کے بارے میں کہی گئیں اُنہیں اُن سے اختلاف ہے۔ شاعر کے تاثرات ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ماحول شاعر کے تاثرات کی پیداوار نہیں ہوتا۔ حالات اگر مایوس کن ہوں تو شعری تخلیق سے مایوسی جھلکے گی، اور قاری کو یہ شعور بخشے گی کہ "ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں"

صہبا لکھنوی نے عابد علی سے اتفاق کیا۔ انہوں نے کہا کہ حالات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو غزل کا موڈ حسبِ حال ہے

نسیم ستر رکھی نے کہا کہ غزل پر تنقید کے لئے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پہلے ہم غزل کے اشعار کو فرداً فرداً لیتے اور اُن پر اظہارِ خیال کرتے۔ ہم اس بات پر بحث کر رہے ہیں کہ ترقی پسند ادبی نقطۂ نظر کیا ہے۔

علی احمد نے کہا کہ ہم کسی ادبی پارے کی خوبی اور خامی ہی نہیں دیکھتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ذہنی اور جذباتی طور پر وہ قاری کو کس سمت لے جا رہا ہے۔ افسردگی اور بیچارگی کا تذکرہ کرنا ادھوری بات ہے۔ پوری بات نہیں۔ ایک ایسے دور میں جب کہ دُنیا کا ایک بہت بڑا حِصّہ نئی زندگی کی تعمیر کر رہا ہے۔ ایسے دور میں جب کہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کی جدوجہد آخری مرحلہ میں داخل ہو رہی ہے۔ اس موڑ پر مایوسی کی

باتیں حقائق سے گریز ہے۔

جوہر حسین نے کہا کہ اگر غزل دسمبر ۱۹۷۱ء سے پہلے لکھی گئی ہے تو اُن کے لئے کلّی طور پر قابل قبول ہے۔ اگر بعد میں لکھی گئی ہے تو یہ صورتِ حال کی صحیح عکاسی نہیں ہے۔

حسن عابدی نے کہا کہ ادب کلنڈر کے حساب سے تخلیق نہیں کیا جاتا۔ ضروری نہیں کہ شاعر کسی واقعہ سے فوری طور پر متاثر ہو اور فوری طور پر اس کا اظہار کرے۔ اس بات کا پورا پورا امکان ہے کہ وہ کسی گزرے ہوتے واقعہ سے بعد میں متاثر ہو اور اس تاثر کا اظہار کسی دوسرے وقت کرے۔

صہبا لکھنوی نے مثال پیش کی کہ ہندو مسلم فسادات کے زمانہ میں ادیبوں نے ایسا ادب پیدا کیا تھا جس کو "فساداتی ادب" کہا گیا۔ زمانہ گزر گیا مگر لوگ اب بھی فساداتی ادب تخلیق کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے اس موقع پر غالب کا یہ مصرعہ پڑھا۔ "نفی سے کرتا ہے اثبات تراوش گویا"۔ انہوں نے کہا بقول غالب نفی برائے اثبات ہو تو یہ عین ترقی پسندی ہے۔ یہی حال افسردگی کا ہے۔ افسردگی برائے افسردگی بُری چیز ہے۔ لیکن افسردگی کے اظہار سے اگر امید کو راہ ملتی ہو تو بُری بات نہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جس طرح افسردگی برائے افسردگی بُری چیز ہے اسی طرح میکانکی امید بھی اچھی بات نہیں۔ غزل پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے خیال ظاہر کیا وہ اس غزل کو کامیاب غزل نہیں تصوّر کرتے، غزل کا موڈ "داغ داغ اجالا" کی حد سے تجاوز نہیں کرتا۔ جد وجہد کی موجودہ منزل اتنی مدہم نہیں کہ مجہول فاعلیت کا مظاہرہ کیا جائے۔ غزل جدو جہد کے موجودہ مرحلے کو گرفت میں نہیں لیتی۔

شوکت صدیقی نے کہا کہ شاعری معاشرتی شعور کی ایک شکل ہے۔ شعور کی دوسری شکلوں مثلاً افسانہ، ڈرامہ وغیرہ وغیرہ کی طرح شاعری بھی جب انسانی شعور کا حصّہ بنتی ہے تو ایک مادّی قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ اُسے ایک مخصوص سمت میں سوچنے اور آگے بڑھنے پر اکساتی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنقیدی نشستوں کی خصوصیت اسی بات میں ہے کہ یہاں ہم ادب کے فنّی اور مادّی پہلوؤں پر گفتگو کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ زیر بحث ادب پارہ قاری کے ذہن کو ترقی کی طرف لے جا رہا ہے یا تنزلی کی طرف۔ غزل پر گفتگو کرتے ہوتے انہوں نے کہا کہ غزل موجودہ صورت حال کی عکاسی نہیں کرتی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ غزل کی شکل میں اتنی لچک نہیں جتنی شعور کی دوسری شکلوں میں موجود ہے۔ زندگی کے نئے تقاضوں کے ساتھ نظم، ڈرامہ، افسانہ اور ناول کی شکلیں نمایاں طور پر تبدیل ہوئی ہیں۔ جب کہ غزل ابھی تک اپنے مزاج اور اسلوب کے اعتبار سے ماضی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تشبیہات، استعارے، علامات اور بندشیں جاگیردارانہ ثقافت کی ترجمانی کرتی ہیں۔

غزل پر بحث ختم ہوئی تو سیّد انور نے اپنے افسانے "مقدّس مریم" کی دوسری قسط پڑھ کر سنائی۔ جوہر حسین نے کہا کہ یہ ادنیٰ بورژوا طبقے کی نہایت ہی غیر ترقی پسند عکاسی ہے۔ صادق مدہوش نے کہا کہ افسانہ نہ تو ادنیٰ بورژوا طبقے کی نمائندگی کرتا ہے اور نہ رجعت پسندی کا ثبوت دیتا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اس ثقافتی دورُخے پن کو گرفت میں لیا ہے۔ جو مغربی اور مشرقی ثقافت کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔

شوکت صدیقی نے کہا افسانہ نگار نے بڑے ہی تلخ انداز میں درمیانہ طبقے کی اخلاقی اقدار پر طنز کیا ہے۔ قمر ہاشمی نے کہا کہ اس افسانہ میں معاشرہ کے سنگین حقائق پر بڑی جرأت مندی کے ساتھ تنقید کی گئی ہے۔ لیکن باپ کا کردار سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک طرف تو وہ اپنی بیٹی کو ڈارلنگ کہتا ہے اور دوسری طرف اِس طرزِ تخاطب کو ناپسند بھی کرتا ہے۔ سحر انصاری نے کہا کہ باپ کا کردار دراصل ایک علامت ہے جو معاشرے کے دو رُخے پن کی مجسّم تصویر بن کر سامنے آتا ہے۔

عباس احمد عباسی نے کہا کہ انہیں افسانہ کا بنیادی خیال ترقی پسندانہ نظر نہیں آتا۔ افسانہ نگار نے زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کے منفی پہلو کو پیش کیا ہے۔ لیکن کچھ اس انداز میں کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ قدریں نہ بدلتیں تو اچھا تھا۔ پرانی قدریں جوں کی توں قائم رہتیں تو بہتر ہوتا۔

غلام عباس نے کہا کہ سیّد انور کا افسانہ ایک نہایت کامیاب افسانہ ہے۔ انہوں نے محسن بھوپالی کی غزل کو بھی بحیثیت مجموعی کامیاب قرار دیا۔

ذوالفقار علی زُلفی

غزل

ہر ایک سمت غموں کا عجب حصار مِلا
مِلا تو صبح کا چہرہ بھی اشکبار مِلا

گلہ خزاں سے کریں کیا کہ اے چمن والو
ہمیں بہار کا دامن بھی داغدار مِلا

قضا و قدر کی مجبوریاں معاذ اللہ
کچھ اختیار مِلا، کچھ نہ اختیار مِلا

اُڑا کے خون کے چھینٹے نئی جوانی دی
بُجھا بُجھا سا ہمیں جب بھی کوئے یار مِلا

حکایتِ غمِ دل ہم نے چھیڑ دی زُلفی
پریشان حال جو رستے میں ذوالفقار مِلا

روٹی کا تھیلا

عبدالمجیب خان

راجہ ساڑھے پانچ فٹ لمبا قوی ہیکل انسان تھا۔اس کا سر بڑا اور ماتھا چوڑا تھا۔اس کے جسم میں بجلی کی سی طاقت تھی۔اس کے بازوؤں میں محنت کرنے کی قوت تھی۔ دن بھر وہ ایمپریس مارکیٹ کے سامنے جہانگیر پارک کے گیٹ پر دل بہار جوس والے کی دوکان پر گنے کا رس نکالتا،اور رات کو ٹھرّے کی چسکی لگا کر جہانگیر پارک کے فٹ پاتھ پر سو جاتا۔

علاقہ کے سارے ٹھیلے والے راجہ سے ڈرتے تھے۔ فتح محمّد موسمّی والا اور سکندر نائی راجہ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔اُسے پڑھنے سے سخت نفرت تھی،پڑھے لکھے لوگوں کو وہ سب سے بڑا احمق کہتا تھا۔اُسے سیاست سے بھی سخت نفرت تھی۔ سکندر نائی اکثر جب اُس سے ملکی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتا کہ فلاں لیڈر نے یہ کہا اور فلاں نے وہ کہا،اس کو گرفتار کر لیا گیا۔اِس کو چھوڑ دیا گیا۔ تو یہ باتیں اُس کے ذرا بھی پلّے نہ پڑتیں۔ یا جب فتح محمد فلموں کے بارے میں کہتا کہ فلاں فلم میں ہیروئن نے ایسا کام کیا۔ بھئی چھم چھم تو قیامت ہے قیامت تو یہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آتیں۔ بس وہ صرف روٹی اور محنت کی بات کرنا جانتا تھا۔ ہر ایک سے یہی کہتا زیادہ محنت کرو گے،زیادہ روٹی ملے گی۔ ایک نمبر روٹی ملے گی۔ اُس نے روٹی کی بھی تین قسمیں کر رکھی تھیں۔"ایک نمبر روٹی بڑے لوگ کھاتے ہیں،صرف کار والے۔ دو نمبر روٹی درمیانے درجے کے لوگ کھاتے ہیں بسوں میں سفر کرنے والے،پیدل چلنے والے اور تین نمبر روٹی ہم جیسے فٹ پاتھیے کھاتے ہیں،ملباری کے ہوٹل کی۔لیکن فتح محمّد دیکھو مزا تو اسی ملباری کی روٹی میں ہوتا ہے"۔ وہ جیب سے روٹی کا ٹکڑا نکال کر دکھاتا۔ اور پھر کھانا شروع کر دیتا۔ بڑی عظیم ہے یہ روٹی۔اس کی اس بات پر فتح محمد موسمّی والا اور سکندر نائی ہنستے۔"ابے تجھے روٹی کے علاوہ اور بھی کچھ معلوم ہے"۔ "دنیا اس روٹی کی طرح گول ہے۔ بالکل گول اور اس دنیا میں بسنے والوں کا آخری سہارا روٹی ہے۔" راجہ بڑے فلسفیانہ انداز میں کہتا۔

جہانگیر پارک کا پورا فٹ پاتھ رات کو ایک ریسٹورنٹ کا کام دیتا۔ علاقہ کے سارے ٹھیلے والے،پھیری والے،گداگر سبھی اس فٹ پاتھ پر رات گزارتے اور صبح ملباری چائے والے کی دوکان پر تین نمبر چائے اور ڈبل روٹی سے ناشتہ کر کے اپنے کام کا آغاز کرتے۔راجہ بھی ملباری کی دوکان پر ناشتہ کرتا،پھر گنّا پیلنے میں جُت جاتا۔ دل بہار جُوس ہاؤس کا مالک اُسے ایک روپیہ دیتا جس میں سے وہ آدھے پیسوں کا ٹھرّا پیتا اور باقی کی روٹی کھا لیتا۔ روٹی اُس کے نزدیک انسان کی سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت تھی۔ اس وجہ سے وہ روٹی کو بڑا عظیم اور متبرک چیز سمجھتا۔جب بھی اُسے راستہ میں کہیں روٹی کا ٹکڑا مل جاتا۔ وہ اُسے بڑے احترام کے ساتھ اٹھاتا۔ کتنے احمق ہیں یہ لوگ روٹی کی قدر نہیں جانتے۔روٹی جو ماں ہے اس کو گھورے پر ڈال دیا ہے۔ذلیل،کمینے کہیں کے۔ پھر وہ اُسے آنکھوں سے لگاتا۔ بار بار چومتا اور اپنے تھیلے میں ڈال دیتا۔

یہی روٹی تھی جس کی وجہ سے وہ گھر سے نکالا گیا۔وہ ہمیشہ اپنے خالی پیٹ میں روٹیاں رکھنا چاہتا تھا اور اس کے خالی پیٹ کو روٹیاں نہیں ملتی تھیں۔ اس کا باپ بمشکل محنت مزدوری کر کے ایک وقت کی روٹی کا سامان پیدا کرتا۔ جو خود اُس کے لئے ناکافی ہوتی۔جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اُس کے پیٹ میں روٹی کی گنجائش بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ دوسروں کی روٹیاں چھین کر اپنے پیٹ میں ڈال لیتا۔اس کی اس عادت پر کئی دفعہ محلّے میں مار پیٹ کی نوبت تک پہنچ گئی۔اس کے باپ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ خود فاقہ کر کے اس کی بھوک کی آگ کو بجھاتا۔ چنانچہ اُس نے اُسے یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا۔" بیٹا اب خود اپنی روٹیاں پیدا کر۔ ہم بھی انہی روٹیوں کے محتاج ہیں۔"

دل بہار جُوس والے کی دوکان پر سولہ گھنٹے کام کرنے کے بعد اس کو ایک روپیہ ملتا۔سولہ گھنٹے محنت کی اُجرت ایک روپیہ تھی۔ جس سے وہ پیٹ بھر کر روٹی کھاتا اور باقی پیسوں کا ٹھرّا پی کر جہانگیر پارک کے فٹ پاتھ پر سو جاتا۔بس یہی اُس کی دُنیا تھی۔یہی اُس کی زندگی کا اصُول ——!!

شام کو جب وہ باغ میں لوگوں کو بے فکری سے قہقہہ لگاتے،تاش کھیلتے دیکھتا تو وہ بڑی حیرت سے فتح محمد سے کہتا۔

"یار ان لوگوں کو بھوک نہیں لگتی یا انہوں نے بہت ساری روٹیاں جمع کر رکھی ہیں۔ دیکھو سامنے وہ چھوکرا کس لے چینی سے لونڈیا کا انتظار کر رہا ہے معلوم ہوتا ہے روٹیاں لا رہی ہوگی اس کے لئے۔"

"ابے تو بھی نرا بیوقوف ہے۔ یار یہ باغ ان لوگوں کی عیش گاہ ہے۔ یہاں درختوں کی چھاؤں میں رنگ برنگے پھولوں کی مہک میں یہ گپ شپ لڑاتے ہیں۔روٹی ووٹی کی ان کو کیا ضرورت ہے۔روٹی حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس بہت سے ذرائع ہیں۔ ہمیں اور تمہیں ہی اسی کی فکر رہتی ہے۔ابے راجے یہ دنیا کا نظام ہے۔ ایک روٹی کی طرف سے بے فکر ہے اور دُوسرا فکر مند۔"

"ابے او راجے کدھر چلا گیا۔دیکھ گاہک کھڑے ہیں۔چل جلدی رس نکال" دل بہار جوس کا مالک آواز لگاتا۔

"آیا صاب ——" پھر وہ دو موٹے موٹے گنے نکالتا اور یا علی کا نعرہ بلند کر کے پہیہ گھمانے لگتا۔

"بتا اے دنیا والے یہ کیسی تیری دھرتی ہے"

جب بھی وہ پہیہ چلاتا اس گانے کو ضرور گنگناتا۔ یہ لو

بابو صاب شربت پیو جان بناؤ۔"

"خدا کے لئے بھوکا ہوں، ایک روٹی کا سوال ہے۔ تین دن سے روٹی نہیں ملی۔ اللہ کے نام پہ۔" ایک بھکاری نے صدا لگائی۔

راجہ گنے کا رس نکالتے نکالتے رک گیا۔ اور اس کی طرف دیکھ کر ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ تجھے بھی میری ہی طرح بھوک لگتی ہے استاد۔ دیکھ وہ سامنے ہوٹل میں چلا جا اور سارے لوگوں کی روٹیاں چھین لے۔ ایسے تو تجھے کبھی روٹی نہیں ملے گی۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔"

"چل بے اپنا کام کر۔" "یہ لو بابا یہ لو۔ اور معاف کرو۔" سیٹھ نے دو ٹیڈی پیسے اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"فتح محمد کبھی کبھی میں سوچتا ہوں یہ دنیا ضرور دو حصوں میں بٹی ہے۔ ایک حصہ وہ جو روٹی کا محتاج ہے اور دوسرا وہ جو روٹی کی طرف سے بے فکر ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ کیسا نظام ہے؟ کس کا نظام ہے؟" راجہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ابے دیکھ یہ اللہ کا نظام ہے، مل جاتے تو کھا لو۔ ورنہ صبر کرو۔"

صبر۔ صبر۔ صبر۔ آخر کب تک صبر۔ میں بچّے سے بوڑھا ہو گیا ہوں صبر کرتے کرتے۔ مجھے سوکھی روٹی سے تازہ روٹی کبھی نہیں ملی۔" مجھے نہیں چاہیے ایسا صبر۔

"معلوم ہوتا ہے راجے اب تو واقعی بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ جبھی ایسی باتیں کر رہا ہے۔ کیوں بے فتح محمد سن رہا ہے نا۔" سکندر نائی اُسترہ تیز کرتے ہوئے بولا۔

"میں بھی یہی کچھ سوچ رہا ہوں۔ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے بھی ٹھیلہ لگاتے کوئی آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ بس اتنا مل جاتا ہے کہ تین وقت کی روٹی کے پیسے بن جاتے ہیں۔ جب میں ان صاب لوگوں کو میم کے ساتھ کار میں دیکھتا ہوں تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں بھی اپنا گھر بساؤں لیکن..." فتح محمد ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔

"بس جی دنیا کا نظام یونہی چل رہا ہے۔ میں حجامت بناتا ہوں تو موسمی بیچتا ہے۔ میں مر جاؤں گا کوئی اور میری جگہ پر آ جائے گا۔ بس دنیا کی گاڑی چلتی رہے گی۔"

بھسم کر دو ایسے نظام کی زنجیروں کو جنھوں نے ہمیں بھوک و افلاس میں جکڑ دیا ہے۔ لوٹ لو ایسے لوگوں کی تجوریوں کو جس میں ہماری روٹیاں جمع ہیں۔ الٹ دو ایسے نظام کو جس میں ہمیں سکون کے ساتھ پیٹ بھر کر روٹی ملنے کا کوئی بندوبست نہ ہو۔ میں تمام فٹ پاتھ پر سونے والوں کو بیدار کروں گا۔ آخر وہ فٹ پاتھ کو کیوں اپنا گھر بنائے ہوئے ہیں۔ وہ تو سب سے زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اس لئے وہ بڑے بڑے خوبصورت گھروں میں رہنے کے حقدار ہیں۔!!

"ٹھیک کہتا ہے راجہ۔ آخر یہ کیسی ناانصافی ہے۔ ہم بھی تو اس دنیا کے انسان ہیں۔ ہمیں بھی خدا نے پیدا کیا ہے۔ اور ایک ہی مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر یہ اونچ نیچ کیسی، پھر یہ فٹ پاتھ اور محل کیوں۔ اللہ کہتا ہے جتنی محنت کرو گے اتنا ہی ملے گا۔ لیکن ہم جتنی محنت کرتے ہیں اس کی پوری قیمت نہیں ملتی۔ آخر کیوں۔ فتح محمد نے حقّہ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "میں سولہ گھنٹے محنت کرتا ہوں اور مجھے ایک روپیہ ملتا ہے۔"

"اور میں تین چار میل سے ٹھیلا لے کر یہاں دکان لگاتا ہوں اور سارے دن میں دو تین روپے بنتے ہیں جس میں سے ایک روپیہ پولیس والا لے جاتا ہے۔"

راجہ نے سیٹھ سے کہا۔ "سیٹھ آج سے سولہ گھنٹے کی اُجرت پانچ روپے ہے۔ تب میں کام کروں گا۔ مِلوں اور کارخانے کے تمام مزدوروں نے بھی اپنے جائز حق کا مطالبہ کر دیا ہے۔ تم لوگ ہماری محنت سے سیٹھ بن گئے ہو۔ ہمیں ایک وقت کی روٹی کے پیسے دیتے ہو اور دوسرے وقت صبر کی تلقین کرتے ہو۔ ہمیں اپنا غلام سمجھتے ہو۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ آخر ہم بھی اسی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں جس سے تم پیدا ہوئے ہو۔"

"کیا بک رہا ہے راجے۔ سولہ گھنٹے محنت کر کے ہم پر احسان کرتا ہے۔ نکل جا آج کے بعد میری دکان پر ہرگز قدم نہ رکھنا۔ پیٹ میں روٹی پڑی تو دنیا نظر آئی۔ مجھے روٹی کے بہت سے ضرورت مند مل جائیں گے۔"

روٹی۔ روٹی کا نام سن کر راجہ نے جلدی سے اپنے تھیلے کی طرف دیکھا۔ اس کا تھیلا اب بھی روٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تازہ اور باسی روٹی میں امتیاز ختم ہونے تک میرے پاس کافی روٹیاں ہیں۔ اُس نے اپنے دل میں کہا۔ اب سولہ گھنٹے محنت کرنے والے تازہ روٹیاں کھائیں گے

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

یہ تاریخ کا فیصلہ تھا، جوان نسل کا فیصلہ تھا، عوام کا عظیم فیصلہ تھا

اپنا پاکستان

(آخری قسط)

نوشتۂ دیوار پڑھ کر اپنی یادیں تازہ کیوں نہیں کرتے

علی جمال

وہ نوشتۂ دیوار پڑھ کر اپنی یاد تازہ کیوں نہیں کرتے وہ تحریر جو ۷ اور ۱۷ دسمبر کو نقش کی گئی، جب پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی بار عوام اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے کے لئے گھروں سے نکلے۔ انتخابات جو قومی افق پر پھیلے ہوتے اقتصادی، سیاسی اور دستوری مسائل پر ایک استصواب رائے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر مسائل پاکستان کی بنیادوں کو متزلزل کر رہے تھے۔ یوم انتخابات سے وہ طویل انتظار۔ صبر آزما انتظار اپنے اختتام کو پہنچا جس میں قوم کو آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا اور جس کے دوران میں خودسر سیاستدانوں۔ بدعنوان نوکر شاہی اور پس پردہ کارفرما ہاتھوں یا خفیہ بادشاہ گردن کے عیار ٹولے نے انسانوں کو جانوروں کی طرح ہانکا۔ اور جو اپنے ڈانواں ڈول راج سنگھاسن کو سنبھالنے کے لئے مختلف گروہوں کا سہارا لیتے رہے۔

اور ذرا نظر دوڑایئے ۷ دسمبر اور ۱۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کے بڑے قومی مقابلے میں میدان میں اترنے والوں اور

۷ اور ۱۷ دسمبر کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں مختلف پارٹیوں کی پوزیشن

	پارٹی	مشرقی پاکستان		پنجاب		سندھ		سرحد		بلوچستان		صوبائی اسمبلی کل سیٹیں	قومی اسمبلی کل سیٹیں
		صوبائی	قومی	صوبائی	قومی	صوبائی	قومی	صوبائی	قومی	صوبائی	قومی		
	کل سیٹیں	۳۰۰	۱۶۲	۱۸۰	۸۲	۶۰	۲۷	۴۰	۲۵	۲۰	۴	۶۰۰	۳۰۰
۱	پیپلز پارٹی	—	—	۱۱۳	۶۲	۳۲	۱۸	۳	۱	—	—	۱۴۸	۸۱
۲	عوامی لیگ	۲۶۸	۱۵۱	—	—	—	—	—	—	—	—	۲۶۸	۱۵۱
۳	آزاد امیدوار	۶	(۱)۰	۲۸	۵	۱۰	۳	۶	۷	۵	—	۵۵	۱۶
۴	مسلم لیگ (قیوم)	—	—	۶	۱	۵	۱	۱۰	۷	۳	—	۲۴	۹
۵	نیپ (ولی)	۱	—	—	—	—	—	۱۳	۳	۸	۳	۲۲	۶
۶	کونسل مسلم لیگ	—	—	۱۵	۷	۴	—	۱	—	—	—	۲۰	۷
۷	جمعیت اہل سنت	—	—	۴	۴	۷	۳	—	—	—	—	۱۱	۷
۸	پاکستان مسلم لیگ، کنونشن	—	—	۶	۲	—	—	۲	—	—	—	۸	۲
۹	جمعیت ہزاروی	—	—	۲	—	—	—	۴	۶	۲	۱	۸	۷
۱۰	پاکستان جمہوری پارٹی	۲	۱	۴	—	—	—	—	—	—	—	۶	۱
۱۱	جماعتِ اسلامی	۱	—	۱	۱	۱	۲	۱	۱	—	—	۴	۴
۱۲	جمعیت اہل حدیث	—	—	۱	—	—	—	—	—	—	—	۱	—
۱۳	نیپ پختون	—	—	—	—	—	—	—	—	۱	—	۱	—
۱۴	بلوچستان یونائیٹڈ فرنٹ	—	—	—	—	—	—	—	—	۱	—	۱	—
۱۵	سندھ متحدہ پٹھان پنجابی محاذ	—	—	—	—	—	۱	—	—	—	—	۱	—

اب عوام سچی جمہوریت کی اقدار کو فروغ دیں گے

جیتنے والوں پر۔ ایسا مقابلہ کہ جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ جب پاکستانیوں کو موقع دیا گیا کہ وہ ان بھلنے مداریوں سے پرامن انداز سے اختیارات چھین لیں۔ اور یہ ہے پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور مشرقی پاکستان کے عوام کا عظیم فیصلہ۔

بدعنوان نوکر شاہی جاہ پرستوں اور خفیہ بادشاہ گروں کے ٹولے کے ہر قیاس، ہر اندازے پر پانی پھر گیا" ایسا پانی کہ انہیں اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔

قومی اسمبلی کی ۳۰۰ نشستوں کے لئے مختلف جماعتوں کے نامزد امیدواروں کی تعداد

نمبر شمار	جماعت	پاکستان کل تعداد	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان	سندھ	پنجاب	سرحد	بلوچستان
	نشستوں کی کل تعداد	۳۰۰	۱۶۲	۱۳۸	۲۷	۸۲	۲۵	۴
۱	عوامی لیگ	۱۶۹	۱۶۲	۷	۲	۲	۲	۱
۲	جماعت اسلامی	۱۴۸	۶۹	۷۹	۱۹	۴۳	۱۵	۲
۳	قیوم لیگ	۱۳۲	۶۵	۶۷	۱۲	۳۴	۱۷	۴
۴	پاکستان پیپلز پارٹی	۱۱۹	-	۱۱۹	۲۵	۷۷	۱۶	۱
۵	کونسل لیگ	۱۱۹	۵۰	۶۹	۱۲	۵۰	۵	۲
۶	جمہوری پارٹی	۱۰۸	۸۱	۲۷	۳	۲۱	۲	۱
۷	جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی)	۱۰۳	۱۳	۹۰	۲۰	۴۷	۱۹	۴
۸	نیپ ولی	۶۱	۳۰	۲۵	۶	-	۱۰	۳
۹	نظام اسلام (تھانوی)	۶۲	۵۴	۷	۱	۴	۲	-
۱۰	جمعیت علمائے پاکستان (نورانی)	۴۸	-	۴۸	۸	۳۹	۱	-
۱۱	نیپ بھاشانی	۲۰	۱۵	۵	۲	۲	-	۱
۱۲	پاکستان نیشنل لیگ	۱۳	۱۳	-	-	-	-	-
۱۳	سندھ کراچی متحدہ پنجابی پٹھان محاذ	۶	-	۶	۵	۱	-	-
۱۴	اسلامک جمہوری پارٹی	۵	۵	-	-	-	-	-
۱۵	جاتی گھا مکتی دل	۵	۴	۱	۱	-	-	-
۱۶	کانگریس	۴	۴	-	-	-	-	-
۱۷	کرشک سرامک پارٹی	۳	۳	-	-	-	-	-
۱۸	مسیحی لیگ	۳	-	۳	۱	۱	۱	-
۱۹	خاکسار	۲	-	۲	-	۲	-	-
۲۰	جمعیت اہل حدیث	۲	-	۲	-	۲	-	-
۲۱	بلوچستان متحدہ محاذ	۲	۱	۱	۱	-	-	-
۲۲	نیپ پختون	۱	-	۱	-	-	-	-
۲۳	پاک وردی شنگھا	۱	۱	-	-	-	-	-
۲۴	سندھ متحدہ محاذ	۱	-	۱	۱	۱	-	-
۲۵	آزاد	۳۱۹	۱۰۹	۲۱۰	۴۶	۱۱۴	۴۵	۵
		۱۵۷۰	۷۶۹	۸۰۱	۱۷۱	۴۶۳	۱۴۲	۲۰۵

عوام نے اپنی اقتصادی، معاشرتی اور معاشی محرومیوں جن کا وہ سالہا سال سے شکار تھے، کے چنگل سے آزادی کے حق میں فیصلہ دیا تھا" استحصالی طبقوں پر فیصلہ کن وار کیا" ایسا وار جس کی پاکستان کی تاریخ میں نظیر نہیں۔ یہ جذبہ بے مثال تھا، یہ جذبہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام نے جماعتوں کے حق میں واضح فیصلہ دیا۔ نہ صرف آزاد امیدوار بھی اس ریلے میں بہہ گئے۔ بلکہ برسہا برس سے لوگوں کو وعدوں وعظوں کے سبز باغ دکھانے والے بھی اس فیصلہ کن عوامی طوفان کی نذر ہو گئے اور سیاسی قیادت جواں سال ہاتھوں میں آگئی۔ تحریک آزادی کے بزرگ مدبّر، محترم سیاستدانوں کے علاوہ جغادری جادوگر شعبدہ باز، نٹ، بھانڈ، مداری اپنی چوکڑی بھول گئے۔ یہ تاریخ کا فیصلہ تھا، یہ جواں نسل کا فیصلہ تھا، یہ عوام کا فیصلہ تھا، یہ نوشتہ دیوار، یہ نوشتۂ تقدیر، اس سے آنکھیں بند کرنا، اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے لیکن شعبدہ باز، جغادری، جادوگر، نٹ بھانڈ اور مداریوں کا شیوہ ہی اپنے آپ کو دھوکہ دینا اور دوسرے کو اس فریب میں مبتلا کرنا ہے۔ لیکن عوام کو اپنا فیصلہ یاد ہے، جواں نسل کو اپنا فیصلہ یاد ہے۔ انہوں نے تو اپنے ہاتھوں مشرقی پاکستان، پنجاب، سندھ، بلوچستان، اور سرحد میں فیصلہ دیا تھا۔ ان کی شعبدہ بازی کے خلاف، اُن کے ڈھونگ کے خلاف، اُن کے سوانگ کے خلاف

اس عوامی ریلے میں جو لوگ بہہ گئے، ان میں ایسے بزعم خود بڑے بڑے نام اور خود ساختہ مقتدر رہنما بھی تھے۔ مثلاً جی ایم سیّد، ایئر مارشل ریٹائرڈ اصغر خاں، میاں طفیل محمّد۔ نواب زادہ نصراللہ خاں، سیّد حسن محمود، میجر جنرل (ریٹائرڈ) سرفراز خاں، سیّد احمد سعید کرمانی، میاں یاسین وٹو، قاسم ملک، ملک غلام جیلانی، چودھری محمّد حسین چٹھہ، مولانا حامد علی خاں، مرزا محمد ابراہیم، حبیب جالب، اے کے بروہی، کنیز فاطمہ، محمود الحق عثمانی، زیڈ ایچ لاری، قاضی فضل اللہ، قاضی فیض محمد، مولانا جان محمد عباسی، سید علمبردار حسن گیلانی، اور نام نام لیتے تو قلم شرمندہ ہوتا ہے۔

خدا ان خود ساختہ فرشتوں کو سمجھے جو اپنی خود ساختہ جنت سے دوبارہ اہتمام کے ساتھ سادہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی "ہدایت"



بندوق کی بات مت کیجئے، محبت کی بات کیجئے

لے کر آئے ہیں۔ یہ پھر گندی کہانیاں بیان کر رہے ہیں۔۔ گندی باتیں کر رہے ہیں، صرف چودہ مہینے پہلے یہ پاکستان کی قسمت مجیب کے ہاتھوں سونپنے کی ہدایت کر رہے تھے۔۔۔ "مجیب جو کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان آخری پل تھا"، مجیب جو متحدہ پاکستان کی آخری شمعِ امید تھا"۔۔۔ "مجیب جو ان کی نگاہ میں اللہ کا بھیجا ہوا آخری آدمی تھا"۔۔۔ "مجیب جو متحدہ پاکستان کی خاطر کلکتے سے سائیکل پر سوار ہو کر دہلی آیا تھا"

لیکن مجیب تو ایک سچا آدمی، دیانتدار آدمی، کھرا آدمی ہے مجیب پاکستان سے کوئی رشتہ نہیں چاہتا تھا، نہیں چاہتا ہے۔۔۔ اس کی دیانت کو سلام، اس کے کھرے پن کو سلام، اس کی سچائی کو سلام۔۔۔ وہ تو بنگلہ دیش چاہتا تھا، اسے بنگلہ دیش چاہیئے تھا، اسے بنگلہ دیش مل گیا۔۔۔ سیکولر ہندو بھارت کی توپوں کی چھاؤں میں۔ معصوم، بے گناہ، مجبور مشرقی پاکستانی مسلمانوں کے خون کی قیمت پر وہ جے ہند اور جے بنگلہ کا نعرہ بلند کرتا ہے۔۔۔ وہ ہند کے ساتھ ہے پاکستان کے ساتھ نہیں۔۔ جس نے اسے پالا، پوسا، پروان چڑھایا اور اپنے آدرش کی خاطر لڑنے کے لیے پناہ دی۔

یہ خود ساختہ فرشتے اب کس آدرش کے لیے لڑ رہے ہیں؟ یہ اپنا آدرش تو بتائیں، اپنے اصول تو وضع کریں اور پھر جو ان میں انتخابات جیتتے ہیں۔ کم از کم اپنے ووٹروں سے تو پوچھیں کہ انہوں نے انہیں کس آدرش کے لیے ووٹ دیا تھا یہ ان ووٹروں کا جمہوری حق ہے۔ یہ ان کے جمہوری حق کو کیوں پامال کر رہے ہیں اور ان کو پوچھے بغیر کیوں قدم اٹھا رہے ہیں لوگ کو عوامی جمہوریت چاہتے ہیں۔ خود ساختہ رہنماؤں کی جمہوریت نہیں چاہیئے۔ سیاست دانوں کی جمہوریت نہیں چاہیئے۔ پیشہ ور ملاؤں کی جمہوریت نہیں چاہیئے، بادشاہ گر ٹولے کی جمہوریت نہیں چاہیئے۔

اب جمہوریت لوگوں کے لیے، مفلوک الحال لوگوں کے لیے جمہوریت مظلوموں کے لیے، محروموں کے لیے، پنجاب میں سندھ میں، بلوچستان میں، سرحد میں قائم ہو رہی ہے اور ہو کر رہے گی۔ اب لوگ خود جمہوریت قائم کریں گے۔ اب عوام سچی جمہوریت کی اقدار کو فروغ دیں گے، جنم دیں گے۔۔ ان کے ماتھے پر کیوں پسینہ آ رہا ہے۔۔۔ یہ کیوں معصوم لوگوں کے جذبات سے کھیل رہے ہیں، انہیں ایک دوسرے کے خلاف کیوں صف آرا کر رہے ہیں۔ سرحد میں ۴۲ ممبروں کی اسمبلی میں سے اپنے ۱۴ ممبروں کی اسمبلی کہاں بلائیں گے اور بلوچستان کی ۲۱ ممبروں کی اسمبلی میں سے ۹ ممبروں کی اسمبلی کس جگہ منعقد کریں گے۔ کس کے خلاف کریں گے، یقیناً عوام کے فیصلے کے خلاف جو انہوں نے ۷ دسمبر اور ۱۷ دسمبر کو دیا تھا، جو انہوں نے اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے دیا تھا جو انہوں نے سازشی ٹولے کی عوام دشمن سازشوں کے خلاف دیا تھا۔۔۔ یہ جمہور کی آواز ہے اس جمہور کی جس

صوبائی اسمبلی کے لئے مختلف پارٹیوں کے نامزد امیدواروں کی تعداد

نمبر شمار	پارٹی	کل تعداد	بلوچستان	سرحد	سندھ	پنجاب	مشرقی پاک
		۶۰۰	۲۰	۴۰	۶۰	۱۸۰	۳۰۰
۱	عوامی لیگ	۳۰۹	۱	۱	۴	۳	۳۰۰
۲	پاکستان پیپلز پارٹی	۲۵۱	۶	۳۱	۴۶	۱۶۴	۴
۳	قیوم لیگ	۲۸۱	۱۴	۳۳	۳۴	۴۰	۱۳۰
۴	نیپ ولی	۱۶۵	۱۳	۳۶	۶	۴	۱۰۶
۵	کونسل لیگ	۲۷۳	۱۰	۸	۲۹	۱۰۷	۱۱۹
۶	کنونشن لیگ	۲۷۲	-	۷	۷	۵۲	۲۰۶
۷	جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی)	۱۵۱	۱۵	۲۲	۲۱	۷۱	۲۲
۸	جماعتِ اسلامی	۳۲۵	۱۱	۲۷	۳۶	۸۰	۱۷۱
۹	جمہوری پارٹی	۲۱۲	—	۳	۱۶	۴۸	۱۴۵
۱۰	جمعیت علما (تھانوی)	۷۳	—	۱	۲	۵	۶۵
۱۱	جمعیت علما (نورانی)	۸۲	—	—	۱۴	۶۸	-
۱۲	نیپ (بھاشانی)	۴۳	—	—	۱	۹	۳۳
۱۳	مسیحی لیگ	۸	—	—	—	۸	—
۱۴	خاکسار تحریک	۴	—	—	—	۴	—
۱۵	کراچی مہاجر محاذ	۱۶	—	—	۱۳	۳	—
۱۶	سندھ متحدہ پٹھان پنجابی محاذ	۵	۱	—	۴	-	—
۱۷	جمعیت اہل حدیث	۳	—	—	—	۳	—
۱۸	جمعیت مجاہدین	۱	—	—	—	۱	—
۱۹	نیپ پختون	۷	۷	—	—	—	—
۲۰	بلوچستان متحدہ محاذ	۴	۴	—	—	—	—
۲۱	پاکستان مسلم لیگ	۴۱	—	—	—	—	۴۱
۲۲	کرشک سرامک پارٹی	۱۰	—	—	—	—	۱۰
۲۳	جاتیہ گنتری دل	۵	—	—	—	—	۵
۲۴	اسلامی گنتری دل	۱۳	—	—	—	—	۱۳
۲۵	کانگریس	۲	—	—	—	—	۲
۲۶	آزاد	۱۶۸۱	۸۲	۱۵۴	۳۴۸	۶۰۸	۴۸۹
		۴۲۳۳	۱۶۴	۳۲۳	۵۷۹	۱۳۰۸	۱۸۶۱



نے سندھ اسمبلی کے لیے، پنجاب اسمبلی کے لیے، بلوچستان اسمبلی کے لیے، سرحد کی اسمبلی کے لیے آپ کے ۹ اور تیرہ (۱۳) ارکان کے علاوہ باقی ممبروں کو بھی ووٹ دے رکھے ہیں۔

آپ جلدی نہ کیجئے ——— آپ کو تاسف ہوگا، ملال ہوگا، اپنے کیے پر پچھتانا پڑے گا۔ آپ جمہوری مزاج کو نہ پہلے سمجھ پائے ہیں اور اب اپنے تئیں دوبارہ غلط اندازے لگا رہے ہیں۔ البتہ آپ کی پہچان عوام کو کھل کر ہوگئی ہے وہ آپ کی شناخت رکھتے ہیں۔ شاید اللہ کو یہی منظور تھا کہ عوام کے سامنے آپ خود ہی اپنے دام میں پھنس گئے۔ ہاں ضرور بلائیے، اپنی اسمبلیاں ضرور بلائیے، اپنے ۱۴ اور ۹ ممبروں کی اسمبلیاں ضرور بلائیے، کہیں یہ وار آپ پر اُلٹا نہ ہو جائے۔ پھر جمہوریت کا رونا رونے گا، تب بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ آپ کے لیے، ہم سب کے لیے، پاکستان کے لیے! خدا آپ کو صحیح فکر کی توفیق دے۔ خدا پاکستان کو بچائے جس کو آپ اپنی بے تدبیری سے ختم کر رہے ہیں۔ کیونکہ آپ صاف ستھری سیاست پر یقین نہیں رکھتے۔ آپ گندی سیاست کے علمبردار ہیں، گندی باتیں کرتے ہیں، گندا کھیل کھیلتے ہیں کیا آپ اپنے ووٹروں کی یہی خدمات انجام دیں گے جنھوں نے آپ کو چنا تھا۔ آپ کی اپنی نسلیں پاکستان کی آئندہ نسلیں، آپ کی تنگ نظری، بدانتظامی، بے تدبیری اور ذاتی خواہشات کو معاف نہ کریں ——— آپ کو تو پتہ ہے ملک کا جو حصہ بچ گیا اس وقت نازک مقام پر ہے ——— آپ اس کی تقدیر سے کھیل رہے ہیں اور الزام دوسروں پر دے رہے ہیں۔ یہ الزام تراشی کا وقت نہیں، دشنام طرازی کا وقت نہیں ہے، یہ بے معنی جمہوریت کا درد کرنے کا وقت نہیں ہے۔ یہ جمہور کے ہاتھوں میں پُرامن ذرائع سے اقتدار کی منتقلی کا وقت ہے ——— خدا را جاگیے اپنی خاطر، اپنے بچوں کی خاطر پاکستان کے اس بچے ہوئے حصے کی خاطر، پاکستان میں آباد انسانوں کی خاطر، ملک کی وحدت کی خاطر اپنے اندر تبدیلی پیدا کیجئے ——— پاکستان کو عظیم بنانے کے لیے، مضبوط بنانے کے لیے ———؟

بندوق کی بات مت کیجئے، محبت کی بات کیجئے، بھائی چارے کی بات کیجئے، اخوت کی بات کیجئے ——— پاکستان تو بے چارہ خون میں نہا رہا ہے ——— پاکستان کو جواں خون کی حرارت چاہیئے۔ جواں خون کو پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہے ——— آپ اگر اپنے وڈیروں کی ایک پنچایت بنالیں اور مشورے تیار کیا کریں اور جواں نسل کو اپنا کام کرنے دیں، تنکا تنکا چن کر اس آشیاں کی ازسرِ نو تعمیر کرنے دیں۔

تعلیم اُن کے ہاتھ آتی ہے جن کے پاس پیسہ ہوتا ہے

احتشام زریں فاروقی

جب ہم لفظ تعلیم سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہی خیال آتا ہے کہ تعلیم اسی چیز کا نام ہے جس کو حاصل کرنے کا حق ہر ایک کو بغیر کسی فرق کے ہوتا ہے لیکن جب ہم اپنے حالات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ تعلیم صرف ان کے ہاتھ آتی ہے جن کے پاس پیسے ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں تعلیم بیچی جاتی ہے۔ تعلیم تک وہی لوگ پہنچ پاتے ہیں جن میں اسے خریدنے کی ہمت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں دو قسم کی تعلیم ملتی ہے مہنگی اور سستی: جس کے پاس زیادہ پیسے ہوتے ہیں وہ مہنگی تعلیم حاصل کرتا ہے، بڑے بڑے انگریزی مدرسوں میں پڑھتا ہے اور جس کے پاس پیسے کم ہوتے ہیں وہ معمولی تعلیمی اداروں کی طرف رُخ کرتا ہے جس کے لیے دو روٹی بھی مشکل سے ہے اس کی قسمت میں تعلیم ہوتی ہی نہیں۔

جھونپڑیوں میں رہنے والے لوگ تعلیم جیسی شے کس طرح پا سکتے ہیں جبکہ مسئلہ صرف اسکولوں اور کالجوں کی فیسوں کا ہی نہیں بلکہ کتابوں اور کاپیوں کا بھی ہے غلام حسین کو بہت افسوس ہے کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلوا سکا، اس لیے کہ وہ غریب ہے۔ ہمیں جھونپڑیوں میں بھی بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ غلام حسین کا خیال ہے کہ تعلیم بہت ضروری ہے۔ اس کے الفاظ ہیں ——— "ہمارا ملک دوسرے ملکوں سے اس لیے پیچھے ہے کہ یہاں پڑھائی عام نہیں ہے۔ اگر ہمارے لڑکے اور لڑکیاں پڑھ لکھ جائیں تو ان کے دماغ بڑے ہو جائیں گے۔ اور ملک ترقی کرے گا۔"

جس وقت وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو یوں لگا کہ جیسے اس کے چہرے پر پڑتی ہوئی دھوپ کچھ تیز ہوگئی ہو۔

ناظم آباد کی پہلی چورنگی پر یو بی ایل کے شیشے کی کھڑکیوں کے نیچے یہ بوڑھا آدمی دھوپ کے چشمے ٹھیک کرتا ہے۔ اس کی چار لڑکیاں ہیں اور ایک لڑکا۔ لیکن وہ کسی بھی بچے کو اسکول بھیجنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ صبح سے شام تک اس پُر رونق بازار میں بیٹھا رہتا ہے اور لوگ اپنے ہاتھوں میں بازار سے خریدا ہوا سامان اٹھائے گزرتے ہیں۔ اس کے پاس اتنا کام آتا ہے کہ کبھی تین اور کبھی چار روپے بنتے ہیں اس طرح اسے مہینے میں سو روپے سے زیادہ نہیں ملتے اور اس کو ان ہی پیسوں میں گھر کے تمام افراد کا خرچ پورا کرنا پڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں انسان کا علاج بھی مشکل ہے۔ بغیر پیسے کے کچھ نہیں ہوتا اور یہ بات ٹھیک بھی ہے۔ ایک تو یہ کہ سرکاری دواخانے کم ہیں اور جو ہیں بھی ان کی حالت بہت خراب ہے۔ جو بیچارے مصیبت کے مارے لوگ وہاں جاتے ہیں وہ صحت یاب نہیں ہو پاتے۔ بس دل کو سمجھانے کے لیے ایسی جگہوں پر آتے جاتے رہتے ہیں۔

وہ خواتین و حضرات جو ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد اپنی ذاتی دکانیں کھولتے ہیں وہ مریض سے معقول فیس لیے بغیر سیدھے مُنہ بات نہیں کرتے اور جو دوائیں اپنے پاس سے بنا کر دیتے ہیں وہ تین چار روپے روز سے کم کی نہیں ہوتیں۔ جبکہ ایک معمولی آدمی کے پورے دن کی محنت کا معاوضہ تین یا چار روپے روز سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ ایسی صورتِ حال میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک عام آدمی کو دوا دارو مل جائے۔

مالی حامد علی کی عمر ساٹھ سال سے کچھ اوپر ہے۔ اس کی کمر دوہری ہو چکی ہے اور اسے جلد کی بیماری ہے۔ اس کے ہاتھ آئے دن پکتے رہتے ہیں مگر وہ گھاس کاٹنے والی قینچی لیے لاٹھی ٹیکتا ہوا اکثر اِدھر اُدھر نظر آتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک بار اس کے ہاتھوں میں بڑی سخت تکلیف تھی اور اس کی انگلیوں سے خون ٹپک رہا تھا ایسی حالت میں وہ ایک ڈاکٹر کی دکان پر گیا اور اس نے کمپاؤنڈر سے کہا کہ وہ ڈاکٹر سے ملنا چاہتا ہے تو اس نے اس غریب سے تلخ لہجے میں پوچھا ——— "پیسے ویسے بھی ہیں یا آگئے یوں ہی تنگ کرنے؟" اس پر بوڑھا مالی تڑپ کر رہ گیا اور بغیر کچھ جواب دیئے دکان سے باہر آگیا کتنے دکھ کی بات ہے کہ ایک شخص مصیبت میں کسی کے پاس اُمید لے کر جائے اور مایوس ہو کر لوٹ آئے۔

آج کل وہ پانچ بنگلوں میں کام کر رہا ہے۔ چار جگہ سے اس کو دس دس روپے مہینہ ملتا ہے اور ایک جگہ سے پانچ روپے ملتے ہیں اور یوں کُل پینتالیس روپے مہینہ وہ کماتا ہے۔ اس کا بیٹا کسی دفتر میں ساٹھ روپے پر ملازم ہے۔ اس طرح دو آدمیوں کی مجموعی آمدنی ایک سو پانچ روپے ہے۔ اس رقم سے ان کو گھر کا خرچ چلانا ہوتا ہے اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حامد علی کا ایک نو سالہ پوتا اسکول بھی جاتا ہے۔ اس کے خاندان میں پانچ افراد ہیں۔ بیوی، بیٹا، بہو، پوتا اور خود! جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا کہ اس کے ہاتھوں میں اکثر تکلیف رہتی ہے اور اس پر بھی اسے کچھ نہ کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔

؎ یہاں حیات کے پردے میں موت پلتی ہے

یہاں سے وہاں تک مسائل ہی مسائل

ہنزہ سے چاٹگام تک

کالج ہے - مگر

یہاں پڑھائی نہیں ہوتی

چترال

یہ اندھیرے کب چھٹیں گے، روشنی کب نمودار ہوگی

نمائندہ الفتح

چترال پاکستان کا پس ماندہ ترین علاقہ ہے۔ ذرائع آمد و رفت کی دشواری، معاشی بدحالی، تعلیمی پسماندگی، ضروریات زندگی کی نایابی، انتظامیہ کی خویش پروری اور اقرباء پروری، بدعنوانی ایسے مسائل فوری اور خصوصی توجہ کے محتاج ہیں۔ یہاں کے عوام موجودہ حکومت سے متوقع ہیں کہ وہ ان مسائل کو فوری طور پر حل کرے گی۔

سابق ریاستوں کے ادغام کے بعد تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لئے حکومت نے چترال کے ضلعی ہیڈکوارٹر میں ایک انٹر کالج کی منظوری دے کر فوری طور پر درس و تدریس کا کام شروع کروادیا۔ کالج کی عمارت کے لئے موجودہ مالی سال کے بجٹ میں رقم مخصوص کی گئی۔ جگہ کا انتخاب بھی کیا گیا، مگر نہ معلوم کن وجوہات کی بناء پر اب تک عمارت کی تعمیر کا کام شروع نہیں کیا گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ کالج میں نہ تو آرٹس کے پورے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور نہ ہی سائنس کا کوئی مضمون پڑھایا جاتا ہے۔ عوام کا مطالبہ ہے کہ کالج کی عمارت، کتب خانہ، ہاسٹل اور دیگر تعلیمی سہولتیں فوری طور پر مہیا کی جائیں اور انٹر کالج کو ڈگری کالج بنایا جائے۔

چترال میں بدعنوانیاں، خویش پروری اور اقرباء پروری انتظامیہ کی روایت بن چکی ہے۔ یہ آسیب کی طرح عوام پر مسلط ہیں اور عوام کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ چترال کے عوام گزشتہ چوبیس سال سے تاریکی اور اندھیروں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پورے چترال میں بجلی نہیں، گزشتہ سال ۲۵ لاکھ روپے بجلی گھر کی تعمیر کے لئے منظور کئے گئے تھے، مگر ابھی تک تعمیر شروع نہیں ہوئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بجلی گھر کی تعمیر کو اولیت دی جائے۔

غریب عوام اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلا سکتے۔ بعض لوگ بڑی مشکل اور تگ و دو کے بعد اپنے بچوں کو پشاور یونیورسٹی اور مغربی پاکستان کے دوسرے تعلیمی اداروں میں بھیج دیتے ہیں۔ حکومت نے تعلیم کی حوصلہ افزائی کے لئے یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ کے لئے وظائف مخصوص کئے ہیں۔ لیکن یہ وظائف مستحق طلبہ کو نہیں دیئے جاتے۔ چترال کی انتظامیہ نے انہیں اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے لئے مخصوص کر لیا اور حق دار، نادار اور مستحق طلبہ ہمیشہ ناامیدی کے بھنور میں ڈبو دیئے گئے۔ طلبہ کے مسائل یہاں پر ہی ختم نہیں ہوتے۔ وہ گوناگوں مشکلات سے دوچار ہیں۔ جب یہ حصول تعلیم کے بعد ملازمت کے لئے حکومت کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ تو انہیں محرومی اور ناامیدی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ گزشتہ دو سال میں جتنے طلباء نے ایم اے، بی اے کیا ہے۔ در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ عوام کا مطالبہ ہے کہ یونیورسٹی اور کالجوں میں زیر تعلیم تمام طلبہ کو وظائف دیے جائیں اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد قابلیت کی بنیاد پر روزگار کی ضمانت دی جائے۔

چترال وہ واحد ضلع ہے جہاں پر ایک پل بھی پختہ نہیں۔ برطانوی حکومت نے اپنی فوجی نقل و حمل کی ضرورت کے تحت چند پل تعمیر کئے تھے۔ ان کی گارنٹی تو کبھی کی ختم ہو چکی ہے۔ اب ان پلوں کی حالت یہ ہے کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا بھی انہیں ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ضلعی ہیڈکوارٹر چترال کو سوج سب ڈویژن کی تین تحصیلوں کے ساتھ ملانے والا واحد پل چیو پل ۱۹۶۹ء میں گرادیا گیا۔ اس پل کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ آج سے پانچ سو سال پہلے چیو نامی ایک کالاش (کافرستان کا باشندہ) نے بنایا تھا جو آج تک اُسی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نومبر ۱۹۶۹ء تک یہ پل زیر استعمال رہا۔ مگر نومبر ۱۹۶۹ء میں سابق ریاستوں کے ادغام کے بعد اس پل کو گرادیا گیا۔ اور نئے پل کے لئے ڈھائی لاکھ روپے منظور کئے گئے۔ جس کی تعمیر ابھی تک نہیں ہو سکی۔ عوام کو معلوم نہیں کہ جو رقم پل کی تعمیر کے لئے مخصوص کی گئی تھی وہ کہاں خرچ کی گئی۔ جس ٹھیکیدار کو تعمیر کا کام سونپا گیا تھا وہ کہاں ہے۔

چترال میں حکومت کی جانب سے مسافروں کی سہولت کے لئے کوئی بس، ویگن یا جیپ سروس آج تک نہیں چلائی گئی۔ ریاستوں کے ادغام کے بعد بھی اس اہم مسئلے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ چترال میں نہ تو حکومت کا کوئی پٹرول پمپ ہے اور نہ کسی نجی کمپنی کا۔ ٹرانسپورٹر پٹرول کا انتظام خود کرتا ہے۔ یہاں پٹرول کی قیمت ۹ روپے سے ۱۰ روپے فی گیلن ہے اس لئے یہاں گاڑیوں کے کرایے بہت زیادہ ہیں۔ چالیس اور پچاس میل سفر میں جیپ کا کرایہ ۱۵ روپے سے ۲۰ روپے فی مسافر ہے۔ اور اگر کسی مسافر کے پاس سامان ہو تو اُسے ۱۰ روپے سے ۱۵ روپے فی من زائد رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ

صاحب مصروف ہیں، اندر ایک اہم میٹنگ ہو رہی ہے

طارق سعید جیلانی

گزشتہ دنوں پاکستان پیپلز پارٹی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے دفتر شکایات میں ایک نواحی چک نمبر ۴۰۰ ج ب، کے بہت سے کسان اور کاشت کار ایک درخواست لے کر آئے۔ جس میں کہا گیا تھا کہ "اُن کے چک میں نور احمد نامی ایک شخص نے سابق حکومت کے دور اقتدار میں فراڈ اور جعل سازی سے ۴۰ مربع اراضی ہتھیالی جب کہ چک کے دوسرے افراد جن کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہے، کے پاس صرف ۴۰ مربع اراضی ہے"۔ درخواست میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ نور احمد کی ناجائز اور غیر قانونی اراضی کو اس سے چھین کر مشترکہ طور پر چک کی تمام آبادی میں تقسیم کر دیا جائے

پاکستان پیپلز پارٹی ٹوبہ ٹیک سنگھ نے درخواست پر غور و خوض کرنے کے بعد ایک سہ رکنی وفد گورنر پنجاب کے مشیر برائے زراعت نواب صادق حسین قریشی کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وفد قومی و صوبائی اسمبلی کے اراکین پر مشتمل تھا۔ یہ وفد ساڑھے دس بجے سیکرٹریٹ پہنچا۔ لیکن مشیر زراعت کے چپراسی نے انہیں مشیر کے کمرے میں داخل نہیں ہونے دیا اور کہا: "اندر ایک اہم میٹنگ ہو رہی ہے۔" ساڑھے گیارہ بجے پھر معلوم کیا۔ تو پھر یہی جواب ملا کہ "اندر میٹنگ ہو رہی ہے۔ صاحب مصروف ہیں۔" وفد ڈھائی بجے تک میٹنگ ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ میٹنگ ختم نہیں ہوئی۔ مجبوراً وفد کے اراکین نے چپراسی کو نواب صادق حسین قریشی کو مطلع کرنے پر زور دیا۔ اس پر چپراسی انہیں نواب صاحب کے پی۔ اے کے پاس لے گیا۔ وفد کے اراکین نے پی۔ اے کو بتایا کہ وہ عوام کے منتخب نمائندے ہیں۔ تمام مسئلہ سے آگاہ کیا اور کہا کہ "نواب صاحب میٹنگ میں مصروف ہیں۔ آپ ان سے وقت ہی لے دیں۔" پی اے نے جواب دیا کہ "آپ اندر چلے جائیں۔ آپ کے لئے کوئی میٹنگ ویٹنگ نہیں ہے۔"

جب وفد کے اراکین نواب صاحب کے دفتر میں گئے تو دیکھا کہ سوائے سیکرٹری زراعت ایم شفیع نیاز کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ وفد جب نواب صاحب سے ملاقات کرنے کے بعد باہر آیا تو دیکھا کہ نواب صاحب کا پی اے چپراسی پر گرج برس رہا تھا اور کہہ رہا تھا "خبردار جو آئندہ کسی شخص کو میرے پاس بھی آنے دیا۔"

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوکر شاہی نے ابھی تک اپنے اطوار نہیں بدلے۔ اگر اس کا رویہ یہی رہا اور عوام کو اپنے مسائل کے حل کے لئے مشیروں کے دفتروں میں گھنٹوں انتظار کرنا پڑا، تو وہ مایوس ہو جائیں گے۔

کوٹری

آبادی پچاس ہزار —— ہسپتال ایک بھی نہیں

نمائندہ الفتح

۳ مارچ کو کوٹری کے مزدوروں کے ایک جلسہ عام میں ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ مزدوروں کے خلاف قائم کئے گئے مقدمات واپس لئے جائیں۔ ایک اور قرارداد میں مزدوروں کی آبادی کے لئے علیحدہ ہسپتال قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

یہ جلسہ عام متحدہ مزدور فیڈریشن کوٹری کے زیر اہتمام پولیس فائرنگ سے ۱۹۶۳ء میں ہلاک ہونیوالے مزدوروں کی یاد میں کیا گیا۔ جس کی صدارت ٹیلی گراف یونین کے صدر صوفی اولیس خاں نے کی۔ اس موقع پر کوٹری کے متعدد مزدور، رہنماؤں نے جلسہ سے خطاب کیا۔ جن میں نشاط کیمیکل انڈسٹریز کے جنرل سیکرٹری زاہد علی، ہدایت اللہ ٹیکسٹائل ورکرز یونین کے جنرل سیکرٹری احمد اللہ، گتہ مل کوٹری کے روشن بلوچ، محمد قاسم جمالی اور انڈس گیس حیدرآباد ورکرز یونین کے جنرل سیکرٹری الف۔ این۔ انصاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ صوفی اولیس خاں نے مزدوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ گورنر اور تمام متعلقہ افسروں نے مزدوروں کے مطالبات کے سلسلے میں وعدے کئے۔ لیکن اب تک ان وعدوں پر عمل نہیں ہوا۔ کوٹری کے مشہور مزدور رہنما احسان عظیم نے مزدوروں کے مسائل پر مشتمل ایک قرارداد پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ کوٹری جیسے شہر میں جہاں آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے۔ وہاں کے عوام اور مزدوروں کے لئے ایک علیحدہ ہسپتال قائم کیا جائے۔ کوٹری میں پانچ ہائی اسکول موجود ہونے کے باوجود کوئی کالج قائم نہیں کیا گیا۔ لہذا ایک کالج کا قیام بہت ضروری ہے۔ مزدوروں کے مسائل فوری طور پر حل کئے جائیں اور مزدوروں پر چلنے والے تمام مقدمات واپس لئے جائیں۔ مہنگائی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ نئی لیبر پالیسی کے تحت تنخواہ بڑھ جانے کے اعلان کے فوراً بعد روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کے نرخ آسمان سے باتیں کرنے لگے ہیں۔ حکومت فوری طور پر مہنگائی کے مسئلہ پر توجہ دے انہوں نے کہا کہ بظاہر اخبارات کو آزادی ہے۔ لیکن اندرونی طور پر اخبارات پر سے ابھی تک پابندی نہیں اٹھائی گئی۔ انہوں نے کہا کہ اخبارات کو مکمل اور غیر مشروط آزادی دی جانی چاہیئے۔

کراچی

پراچہ ملز کی انتظامیہ

مزدوروں میں انتشار پھیلا رہی ہے

الفتح رپورٹ

پراچہ ملز کے مالکان یونین میں انتشار پھیلانے اور مزدوروں کو آپس میں لڑانے کی ناپاک سازشوں میں مصروف ہیں۔ یہ الزام پراچہ ٹیکسٹائل ملز آزاد لیبر یونین کے جنرل سیکرٹری جناب مظفر خان نے لگایا ہے۔ انہوں نے انتظامیہ کے جاری کردہ اس نوٹس کو بھی لغو اور مضحکہ خیز قرار دیا ہے جس میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسٹاف کے ملازمین مزدوروں کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ یہ نوٹس مزدوروں اور سٹاف کے ملازمین کو لڑانے کے لیے جاری کیا گیا ہے جنرل سیکرٹری نے کہا کہ انتظامیہ مزدور دشمن ہتھکنڈوں کے ذریعے مزدور کو مزدور سے لڑانے کی پالیسی میں ہرگز ہرگز کامیاب نہ ہو گی۔ انہوں نے اسٹاف ورکرز کی یونین میں شمولیت کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ اسٹاف کے ساتھیوں نے اس گھٹیا نوٹس کا جواب مزدور اتحاد اور یکجہتی سے دیا ہے۔ اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ سرمایہ دار اب زیادہ دیر اپنی سازشوں کے سہارے نہ چل سکے گا۔ انتظامیہ مزدوروں میں صوبائی تعصب کو ہوا دے رہی ہے لیکن ملز کے مزدور اس کا جواب اپنے اتحاد اور اشتراک عمل سے دیں گے۔



قارئین کہتے ہیں

اِس بات کا بھی خیال کیجئے

ہمارے صدر اور وزیر محنت صاحب نے لیبر پالیسی کے چند نکات کا اعلان کیا ہے ہمیں امید واثق ہے کہ یہ لیبر پالیسی ہمارے لیے خوش آئند ثابت ہوگی اور یہ امید بھی وابستہ ہے کہ اس پر پوری طرح سے عمل درآمد کیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے پہلے سابقہ حکومتوں نے بھی لیبر اصلاحات کا اعلان کیا لیکن اسے کوئی قانونی تحفظ نہیں دیا گیا جس کی وجہ سے آجر اور مزدور کے درمیان مزید تفریق پیدا ہو گئی۔ آجر نے مزدور دشمنی کا پورا حق ادا کیا۔ امید ہے کہ اب جبکہ مزدور کسان اور طلباء کی حکومت ہے پرانی روایات کو نہیں دہرایا جائے گا۔ بلکہ اسے عملی شکل دی جائے گی لیکن اس کے ساتھ چند اور مشکلات ہیں۔ جس کی وجہ سے صنعتی بے چینی ہے۔ اس کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

۱۹۶۹ء میں انتخابات کے دوران کچھ ملوں سے جب مزدوروں کو ان کے حق سے محروم کر کے نکالا گیا تو ان ملوں کو تین اور کسی کو دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا اور ان کے الگ الگ لائسنس لیے گئے۔ ان کے نام الگ الگ رکھے گئے۔

مثال کے طور پر آپ اقبال سلک ملز کو لے لیں اس کے اندر اب دو ملیں قائم ہیں۔ ایک کا نام عامر سلک ملز اور دوسرے کا نام بہار سلک ملز ہے۔ تو ان ملوں میں نئی بھرتی کی گئی۔ ان مزدوروں کو ہر تین ماہ کے بعد ایک مل سے دوسری مل میں بھیجا گیا تاکہ مزدور کی سروس مستقل نہ ہونے پائے۔ لیکن اس کے ساتھ دونوں ملوں میں کام لیتے رہے لیکن تنخواہ ایک ملز سے ملتی رہی۔ اب جب کہ عوامی حکومت ہے اس چیز کو دوبارہ دہرایا جا رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مزدوروں میں پھر صنعتی بے چینی پھیل رہی ہے۔

جب سابقہ حکومت نے ہنگامی حالات کا اعلان کیا تو ان مزدوروں کو روزانہ کے حساب سے اجرت دی گئی۔ اور دوبارہ جب ملیں کھلیں تو بجائے اس کے پورے مزدوروں کو واپس لیا جاتا، پورے مزدوروں کو کام پر واپس نہیں لیا گیا بلکہ ہر ملز میں جس جگہ پچاس لومز لگی ہوئی تھیں وہاں ۲۵ لومز کے گرد دیوار کھینچ دی گئی اور باقی لومز کو چلایا گیا جس کی وجہ سے آدھے مزدور ابھی تک بے کار ہیں۔

جن مزدوروں کو دوبارہ کام پر لیا گیا ہے ان سے نئے فارم پر دستخط کرائے گئے اور ساتھ ہی مل مالک نے جو مل بند کی تھی اس کی تنخواہ نہیں دی گئی۔

سید کلب حسن شاہ کاظمی —— حلقہ اگرہ تاج کالونی کراچی

سقوطِ ڈھاکہ کی فلم دکھائی جائے

۹ر جنوری ۱۹۷۲ء کو کراچی میں "سقوط ڈھاکہ کی فلم" کا کچھ حصّہ ٹی وی پر دکھایا گیا۔ جس میں ڈھاکہ میں پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کا حال دکھایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستانی جنگی قیدیوں پر ہندوستانی فوج کے ظلم اور زیادتیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ جنگی قیدیوں کو بے رحمی کے ساتھ مارا پیٹا جا رہا ہے اور پاکستان کے بہادر اور خود دار فوجیوں کو ہتھیار ڈلوانے کے بعد ذلیل کیا جا رہا ہے۔

اس کے برعکس حالیہ جنگ میں مغربی محاذ پر بھارت کے فوجی گرفتار ہوئے۔ ان میں ایک ہندو فوجی مہلک طور پر زخمی تھا۔ پاکستانی حکام نے اس کا علاج کرایا اور مسلمانوں کے خون کی چھ بوتلیں اس کے جسم میں چڑھا کر اس کی جان بچائی۔ اس کے برخلاف بھارتی حکومت پاکستانی فوجیوں سے باعزت سلوک کا وعدہ کرنے کے بعد بھی ہتھیار ڈالنے والے فوجیوں پر دردناک مظالم ڈھا رہی ہے۔ یہی سب کچھ اس فلم میں دکھایا گیا ہے۔ شیخ مجیب کا آخری انجام وہی ہوگا جو آنجہانی پنڈت نہرو کے یار غار شیخ عبداللہ کا ہوا ہے۔

اگر ہمارے سربراہ اسلام آباد کی تعمیر میں اربوں روپیہ صرف کرنے کی جگہ اس روپیہ کو بری بحری اور ہوائی قوت کو بڑھانے میں صرف کرتے تو آج پاکستان کو یہ ذلت نہ اٹھانی پڑتی۔

اچھا ہوا کہ سقوطِ ڈھاکہ کی فلم پر نظر پڑ گئی۔ اس فلم نے مسلمانوں کی، خاص کر پاکستانیوں کی غیرت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہمیں پارٹی بازی اور صوبہ پرستی کے کھیل کو چھوڑ کر الجزائر کے سرفروشوں، ویت نام کے جانبازوں کی طرح دشمن پر پوری طاقت سے ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ یہ فلم عوام کو ضرور دیکھنی چاہیئے۔

زوار حسین —— رضویہ کالونی کراچی

کیا ہمارے حالات بدل جائیں گے

"عوامی راج مبارک ہو" مجھے اور مجھ جیسے ہزاروں غریب کسانوں، مزدوروں کو یہ امید تھی کہ ہمارا بھٹو صاحبِ اقتدار آنے کے بعد ہماری حالت بدل دے گا اور وہ اپنے وعدے کے مطابق اپنے منشور کو عملی شکل میں نافذ کرے گا۔ مجھے امید تھی کہ بھٹو کی قیادت ہمارے بچوں کو کپڑا دے گی۔ ان کے پیٹ میں روٹی ہوگی اور یہ بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونگے مگر میرے بھائی! مجھے یوں دکھائی دیتا ہے کہ ہمارا یہ خواب یوں پورا نہ ہوگا۔ آج اور کل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ "ہمارے قائد" نے ہم سے ضروریات زندگی کی آسائشوں کا وعدہ کیا اور ہم سے اپنی کامیابی کا وعدہ لیا۔ ہم غریب اپنے وعدے میں پورے اترے۔ ہم نے بھٹو کو کامیاب کیا۔ جس کے بدلے زمینداروں نے ہمیں زمین سے بیدخل کیا۔ ہمارے ڈور ڈنگر چوری کرا لئے گئے۔ ہمیں اپنی عزتوں کو غیر محفوظ پا کر زمینوں کو چھوڑنا پڑا۔ "زمین جو کسان کی ماں ہے"۔ پھر بھی ہم صدر بھٹو کے ساتھ رہے، مگر صدر بھٹو یقیناً ملک کے غریبوں کو بھول گئے۔ یہ دستور، یہ اسمبلیاں،

یہ مارشل لاء، یہ بڑے بڑے بھاری بھرکم قانون دان، ان سے ہم لوگوں کی کیا حالت بہتر ہوگی۔ اسمبلیوں میں زمینداروں کی یا اُن کے حواریوں کی اکثریت ہے، اب ہم کیسے کہیں کہ دستور غریب ہاری کے مفاد کا تحفظ کرے گا۔

آپ کے رسالہ سے ہم نے روشنی حاصل کی۔ "الفتح" سے ہی ہماری امیدیں وابستہ ہیں۔ کہیں یہ بھی ہماری قیادت سے کنارہ نہ کرلے۔ "بھٹو صاحب! عوام کا پیٹ تقریروں سے نہ بھریئے" آپ کے رسالے میں پڑھا۔ سوچتا ہوں کہ میری طرح سوچنے والے جانے اور کتنے لوگ ہیں جو اس قیادت سے اتنی جلدی مایوس ہو گئے ہیں

اب ہم کیا کریں؟ اب تک ہم نے اسلام اور جمہوریت کے نام پہ دھوکہ کھایا۔ یہ جی کے ذریعہ اسلام اور جمہوریت کو نافذ کرنے کی سعی کی۔ نہ اسلام آیا اور نہ ہی ہم نے عوامی جمہوریت دیکھی اور اب ہم عوامی مارشل لا بھی دیکھ رہے ہیں (خالد ندیم ارشد۔ بستی کامدار (رحیم یار خان)

بقیہ : احوال واقعی

کا موقع نہ دیا جائے۔ لیکن بات نہ بن سکی۔ بھٹو صاحب کے حکومت میں آنے سے اس ٹولے کو مایوسی ہوئی۔ انہیں ڈر تھا کہ اُن سے تعلقات استوار نہ ہوسکیں گے۔ پیچھے سے ڈوری ہلائی گئی کہ فکر کی بات نہیں۔ یہ حکومت چند روزہ ہے۔ اصل طاقت تو ہم لوگ ہیں۔ ڈوری ہلتی رہی۔ جس روز ڈوری نہ ہلی۔ ماتھا ٹھنکا، معلوم ہوا کہ بھٹو کی حکومت پکی ہوگئی۔ اور خفیہ حکومت کا سراغ لگ گیا۔ وہ آؤٹ ہوگئی۔ معافیاں اور پھر تلافیاں۔ اب بھٹو کے قریب پہنچ کر یہ لوگ اس کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ہماری پارٹی صرف آپ ہیں۔ آپ اپنی ٹیم کو بدل لیں۔ اور یہ افواہیں بھی پھیلا رہے ہیں کہ ڈاکٹر مبشر بھی جانے والے ہیں، پیرزادہ سے وزارت اطلاعات لی جارہی ہے۔ معراج کو پارٹی کی تنظیم سے بالکل الگ کر دیا جائے گا۔ صدر بھٹو کے یہ دوست؟

ع۔ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

بھٹو صاحب مخلصانہ طور پر جو کچھ کر رہے ہیں، ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں لیکن ایوان صدر میں ان لوگوں کی ملاقاتیں، محض معافی کے بعد معاملہ طے ہوجانا۔ جدی پشتی عوام دشمنوں سے سمجھوتہ اچھے شگون نہیں ہیں۔ عوام کی حمایت کی بجائے ان طاقتوں سے رشتے استوار کرنا اور دانش وروں کے محاذ پر راشدی، معظم علی اور میر خلیل الرحمان جیسے لوگوں سے اتحاد، پیپلز پارٹی کے ان لاکھوں کارکنوں کو مایوس کردے گا جنہیں ان سیاہ قوتوں کے خلاف مظاہرے کرنے کے لئے بھٹو صاحب نے اب تک استعمال کیا تھا۔ اور جو ان لوگوں کا کردار جانتے ہیں۔ وہ یہی سوچیں گے کہ اوپر والے اوپر والوں سے مل گئے۔ اصول نظریات دھرے رہ گئے۔

بلندیوں پہ سیاہ و سفید مل ہی گئے۔

بقیہ : اسحاق محمد کا انٹرویو

کی رہنمائی جو اپنے معاملات کو سائنسی سوشلزم کی روشنی میں طے کرتی ہے۔ صرف اسی طریقے سے عوامی جمہوری انقلاب کو ریاستی انقلاب تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اور ریاستی اقتدار کو سوشلزم کی ترویج کا"۔

جناب اسحاق محمد نے بتایا کہ "ہشت نگر کسان تحریک کے دو پہلو ہیں ایک کو تخریب کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے کو تعمیر کا، یہ تحریک جاگیرداری افسر شاہی استبداد ظلم و جبر کی تخریب کر رہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ عوامی اقتدار کے ایسے اداروں کو رواج دے رہی ہے جن کے ذریعے کسان نہ صرف اپنے آپس کے دیوانی اور فوجداری تنازعہ طے کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا نمونہ ہے جس سے دوسرے علاقوں کے کسان متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ اور ڈھکی چھپی نہیں کہ ہشت نگر کا فلسفہ صوبہ سرحد کے علاوہ پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں بھی مقبول ہو رہا ہے کسان تحریک کا مستقبل روشن اور درخشاں ہے، اُمید کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ اب تک ہم نے جو کچھ کیا وہ درحقیقت بہت معمولی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے تحریک کی صحیح سمت پالی ہے۔ اور میرے خیال میں اسی سمت پہ چل کر ہماری قوم چینی قوم کی طرح ایک صحت مند، خوشحال، انسان دوست اور استحصال سے پاک معاشرے کو جنم دے گی۔ نئی صبح ضرور طلوع ہوگی"۔

بقیہ : افسانہ

ہم اپنی تحریک کو جاری رکھیں گے، خواہ میرے پاس تمام روٹیاں کیوں نہ ختم ہوجائیں۔ اب میں اپنی بھوک پر بھی قابو رکھوں گا۔ فاقہ کروں گا۔ سولہ گھنٹے محنت کی قیمت پانچ روپے مقرر ہونے تک۔ ناانصافی کے اس نظام کو اب ہمیں ختم کرنا ہے۔"

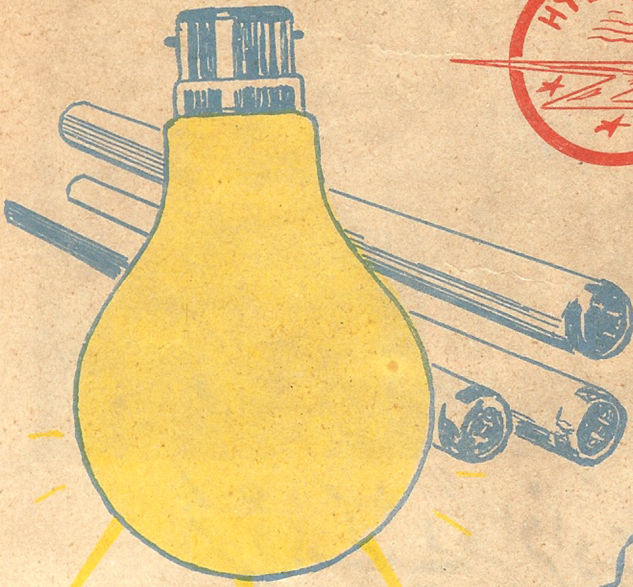
"بدمعاش، اُلّو کے پٹھے۔ تیری یہ مجال، تحریک چلائیگا"۔ سیٹھ نے اُٹھ کر برقی قوت کے ساتھ گھونسے اور تھپڑ راجہ پر برسانے شروع کر دیئے۔ ایک گھونسہ اُس کے پیٹ میں لگا۔ اور اس کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ دفعتاً بہت سارے راہگیر اس کے گرد جمع ہوگئے۔

"کیا ہُوا؟ بھئی کیا ہوگیا۔"

"مذہب کو بُرا کہتا ہے، بدمعاش"۔ سیٹھ نے دانت پیستے ہُوئے کہا۔

"مارو سالے کو۔ مارو۔ ٹھیک ہے؟"

راجہ کو اپنا سر گھومتا ہُوا محسوس ہُوا، اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اُسے خلاء میں اچھال دیا ہے۔ وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ روٹی کا تھیلا اُس نے مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں بھینچ رکھا تھا۔



ہم

آپ کے اندھیرے دُور کر کے

روشنی

پھیلاتے ہیں

حئی سنز کے بلب اور ٹیوب

روشنی کے سرچشمے

حئی سنز گروپ آف انڈسٹریز۔ حئی چیمبرز، ویسٹ وہارف، کراچی فون ۲۲۰۸۸۱ / ۲۲۰۴۶۵

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
9-16, MARCH, 1972

رہائشی مسائل کے فوری اور آسان حل کے لئے

سلمان لمیٹڈ

کراچی کے بے گھر افراد کیلئے ایک اور خوشخبری

ہم سلمان لمیٹڈ کی طرف سے فخریہ اعلان کرتے کہ ہماری "بوستانِ رضا" اسکیم کا کراچی کے بے گھر لوگوں نے اتنے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا کہ ایک مختصر سے عرصے ہی میں اس اسکیم کے نوّے فیصد پلاٹ بک ہو گئے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری شرائط اتنی آسان ہیں کہ ایک معمولی آمدنی والا شخص بھی پلاٹ خرید سکتا ہے/۶۶۰ روپے نقد اور پچاس روپیہ ماہوار کسی بھی درمیانے اور قلیل آمدنی کے طبقے کے فرد کیلئے زیادہ بار نہیں۔

سلمان لمیٹڈ

"بوستانِ رضا" اسکیم کی کامیابی کے بعد کراچی کے لاکھوں بے گھر افراد کے لئے جلد ہی دو اور نئی ہاؤسنگ اسکیموں کا اعلان کرنے والے ہیں۔ ان اسکیموں کی شرائط بھی اتنی آسان ہوں گی کہ معمولی آمدنی رکھنے والا شخص بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکے گا۔ آپ ابھی سے پلاٹ حاصل کرنے کی تیاری کیجئے کیونکہ اپنے ذاتی مکان کے بغیر اس دور میں زندگی ایک عذاب سے کم نہیں

سلمان لمیٹڈ

۱۱۱ محبوب چیمبرز۔ صدر۔ کراچی
فون ——— 516389

HAQQI OFFSET PRESS Karachi.